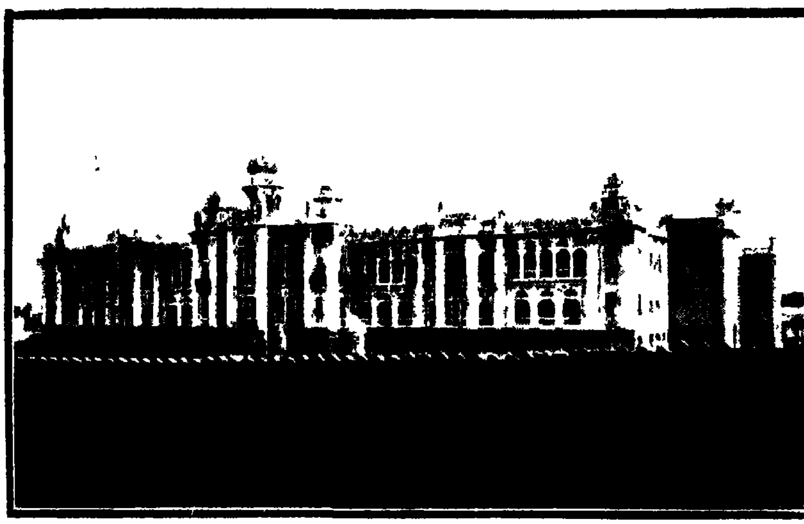
الموسی



طلباے سٹی کالج کا سہ ماہی رسالہ

نویں جلد
پہلا اور دوسرا نمبر

بابتہ
آذر و اسفندار ۱۳۵۱ف

المُوسیٰ

طلبہ سٹی کالج کا علمی و ادبی رسالہ

(زیرِ نگرانی)

جنابِ سید محمد اعظم صاحب ام، اے، بی، ایس، سی (کینٹب) صدرِ کلیہ

جناب ابو ظفر عبدالواحد صاحب ام، اے
(لکچرار انگریزی)

جناب سید محمد صاحب ام، اے
(لکچرار اردو و فارسی)

مُدیر — سید احمد حسینی متعلم سال دوم
نائب مُدیر — سلام اللہ خاں متعلم سکستھ فارم

(مقامِ اشاعت)

دفتر المُوسیٰ — سٹی کالج — حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

نشان سلسلہ	عنوان مضمون	مضمون نگار	صفحہ
(۱)	ٹیگور کی سرگزشت	ادارۂ تحریر	(۱)
(۲)	وشوا بھارتی	س۔م	(۱۴)
(۳)	رابندرناتھ ٹیگور	مولوی سید مہدی حسین صاحب	(۱۸)
(۴)	ننھے کی دنیا	ڈاکٹر ٹیگور آں جہانی	(۳۲)
(۵)	شاعر اعظم ٹیگور	افتخار احمد متعلم جماعت دہم	(۳۳)
(۶)	ٹیگور کی ادبی خدمات	محمد علی ناصری " "	(۴۰)
(۷)	شانتی نکیتن	مصطفیٰ محی الدین متعلم سال اول	(۴۳)
(۸)	سمندر کے ساحل پر	ڈاکٹر ٹیگور آں جہانی	(۴۹)
(۹)	ای تاگر	ملک الشعراء بہار	(۵۰)
(۱۰)	شاہ جہاں	ڈاکٹر ٹیگور آں جہانی	(۵۲)
(۱۱)	اے میرے بدنصیب وطن	" "	(۵۶)
(۱۲)	ٹیگور اسّی سال کی عمر میں	مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی	(۵۷)
(۱۳)	رابندرانات تاگور	آقائی رشید یاسمی	(۶۳)
(۱۴)	کاغذ کی ناؤ	ڈاکٹر ٹیگور آں جہانی	(۶۴)
(۱۵)	اردو زبان اور ٹیگور	رفیع الدین فاروقی سال اول	(۶۵)

صفحہ	مضمون نگار	عنوان مضمون	نشان سلسلہ
(۷۴)	سید احمد حسینی سال دوم	رابندر ناتھ ٹیگور کا پیغام	(۱۶)
(۸۱)	مرزا اظہر افسر سال اول	کمرہ	(۱۷)
(۸۴)	سلیمان ادیب سابق طالب علم	پیام شباب (نظم)	(۱۸)
(۸۵)	انوار احمد صاحب صدیقی سابق طالب علم	صنعتی انقلاب	(۱۹)
(۹۹)	کبیر خاں صاحب کاوش سابق طالب علم	واردات (نظم)	(۲۰)
(۱۰۰)	سید محمود محمودی سال اول	ہماری غذا	(۲۱)
(۱۰۵)	سید عابد حسین رضوی سال دوم	فانی مرحوم	(۲۲)
(۱۰۹)	سکندر علی خاں نادر سال اول	میر و غالب کی آخری یادگار	(۲۳)
(۱۱۴)	سید احمد حسینی شاہد سال دوم	تمنا (نظم)	(۲۴)
(۱۱۵)	خواجہ عبد القادر چشتی سال اول	فانی کی شاعری	(۲۵)
(۱۱۸)	سید ناظم علی ناظم جماعت دہم	غزل	(۲۶)
(۱۱۹)	ذاکر حسین نقوی سال اول	حضرت فانی بدایونی	(۲۷)
(۱۲۲)	لطیف شریف ساجد سال دوم	زوال عروج	(۲۸)
(۱۲۳)	سید عابد حسین رضوی	افتتاحی تقریر نائب صدر انجمن	(۲۹)
(۱۲۶)	....	کالج سنسار	(۳۰)

مطبوعہ

مطبع ابراہیمیہ

حیدرآباد

قواعد

(۱) سٹی کالج کے طلبہ کا یہ سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ "اَلمُوسیٰ" عموماً آذر، اسفندار خورداد اور شہریور کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کریگا۔

(۲) اس رسالہ میں عموماً طلبہ حال و سابق کے دلکش مضامین، افسانے، ڈرامے اور نظمیں شائع ہوا کرینگی۔ نیز کالج کی دلچسپ خبریں پُرلطف انداز میں پیش کی جائینگی۔

(۳) علمی مسائل پر سلیس اور تعلیمی مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع کئے جائیں گے۔

(۴) دل آزار مذہبی تنقیدوں اور مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ کو کسی طرح جگہ نہیں دیجائیگی۔

(۵) رسالہ کی ضخامت عموماً (۸۰) صفحات ہوگی۔

(۶) سالانہ چندہ طلبۂ حال سے دو۲ روپیہ اور طلبۂ قدیم سے تین۳ روپیہ اور دیگر خریداروں سے چار۴ روپیہ لیا جائیگا۔

(۷) تمام مضامین نظم و نثر مدیر کے نام بھیجے جائیں اور ترسیل زر اور دیگر امور کیلئے مینجر رسالہ سے خط و کتابت کی جائے۔

(۸) خلاف تہذیب اشتہارات شایع نہیں کئے جائیں گے۔

ٹیگور کی سرگزشت

مرتبہ
ادارۂ تحریر

۱۸۶۱ء ۷ مئی سہ شنبہ۔ دیویندر ناتھ اور سارادا دیوی کی چودھویں اولاد، رابندر ناتھ ٹیگور پیدا ہوئے۔

۱۸۶۹-۷۰ء اورینٹل سیمنری میں شریک کرایا گیا اور کچھ دن بعد نارمل اسکول کلکتہ میں۔ ابتدا یہیں تعلیم ہوئی۔

۱۸۷۱-۷۲ء بنگال اکیڈمی اور پھر اینگلو انڈین اسکول میں شریک ہوئے۔ لیکن کہیں بھی بہت زیادہ شوق سے نہیں پڑھے۔

۱۸۷۳ء ایک ڈراما "پرتھوی راج کی شکست" لکھا۔ والد کے ہمراہ شمالی ہندوستان کا تفریحی سفر کیا اور دوران سفر میں سنسکرت اور انگریزی پڑھی۔

۱۸۷۴ء کلکتہ واپس آئے اور سینٹ زیویر اسکول میں شریک ہوئے۔ میکبتھ کا ترجمہ بنگالی زبان میں کیا جو بھارتی میں شائع ہوا۔

۱۸۷۵ء ایک ہندو میلے میں اپنی پہلی نظم مجمع عام میں سنائی۔ یہ نظم امرت بازار پتریکا میں چھپی۔ ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔

۱۸۷۶ء ایک طویل نظم "گل صحرا" لکھی جو ایک بنگالی رسالے کے مسلسل آٹھ نمبروں میں شائع ہوئی۔

۱۸۷۷ء لارڈ لٹن کے دہلی دربار کی ہجو میں ایک نظم لکھ کر ہندو میلے کے جلسے میں سنائی۔ دویجیندر ناتھ ٹیگور [illegible] بھائی نے بھارتی کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس میں ان کا پہلا افسانہ [illegible] شائع ہوا۔ طویل افسانہ بھکارن [illegible]۔ طویل نظم سرگزشت شاعر۔ تنقیدی مضامین انگریزی [illegible]۔ سیکسن اور ان کا ادب اور بیٹرس [illegible] اور دانتے اسی سال کے ادبی کارنامے ہیں۔

۱۸۷۸-۷۹ء پہلا سفر۔ ستیندر ناتھ آئی سی ایس [illegible] بھائی [illegible] اور پھر ان کے ہمراہ انگلستان [illegible]۔ [illegible] کے ایک اسکول میں اور پھر یونیورسٹی کالج لندن [illegible] شرکت کی۔ [illegible] مارلے کے [illegible] انگریزی ادب [illegible] مغربی علم موسیقی کی تحصیل کی۔ گلیڈسٹن [illegible] کی تقاریر سننے کے لیے [illegible] کے اجلاس میں بھی شرکت کی۔ برٹش میوزیم [illegible] رہی۔ بھارتی میں

"ترانۂ یورپ" کے خطوط کی اشاعت ہوئی۔ منظوم ڈراما "شکستہ دل" کی ابتدا یہیں ہوئی۔

۱۸۸۰ء سنہ بغیر سند کے واپس ہوئے۔

۱۸۸۱ء سنہ غنائی ڈراما "والمیکی کی ذہانت" کی اشاعت اور پیش کشی عمل میں آئی۔ چین میں افیون کی تجارت کے سلسلے میں "چین میں موت کی تجارت" پر مضمون لکھا۔ "موسیقی اور جذبات" پر کلکتہ میڈیکل کالج میں سب سے پہلی تقریر کی۔ "شام کے گیت" نامی نظموں کا مجموعہ شایع ہوا۔ انگلستان کے ارادے سے مدراس کا سفر کیا اور وہیں سے واپس ہو گئے۔ ناول "دی ینگ کوئینس مارکٹ" بھارتی میں مسلسل شایع ہوا۔ اور ایک بے قافیہ منظوم ڈراما "رودر چند" کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۸۸۲ء سنہ انڈین میوزیم کلکتے کے قریب اقامت اختیار کی۔ ایک غنائی ڈراما "مہلک شکار" شایع کیا جس میں راجہ جسرتھ کے ہاتھوں اندھے رشی کے بیٹے کی ہلاکت کا واقعہ لکھا گیا ہے، اس کی پیش کشی عمل میں آئی۔ ٹیگور نے ورانڈے میں کھڑے ہوئے ایک رویت دیکھی جس سے ہر معمولی چیز ان کے لیے وقیع اور معنی خیز بنی۔ "فوارے کی بیداری" (مشمولہ مجموعہ نظم "صبح کے گیت")۔

۱۸۸۳ء سنہ منظوم ڈراما "انتقام فطرت" لکھا جس کا انگریزی ترجمہ "سنیاسی" کے نام سے ہوا۔ سیاسی مضامین لکھے۔ ۹ر دسمبر کو مرنالنی دیوی سے شادی ہوئی۔

۱۸۸۴ء سنہ ان کی بھاوج کا انتقال ہوا جو ان کے لیے صدمہ جانکاہ تھا، اور اس کا نتیجہ "تصاویر اینڈ فلیاٹس" کی الم انگیز نظمیں ہیں جن کا ترجمہ شیلے، مسز براؤننگ، آرنسٹ، بایرن، آبری ڈی ویری اور وکٹر ہیوگو وغیرہ نے کیا ہے۔ آدی برہمو سماج کے معتمد مقرر ہوئے۔ مشہور ناول نگار بنکم چندر چٹرجی سے مباحثہ کیا۔ ڈراما تالیفی وسطی وشنو شعرا کی تقلید میں برج بھاشا کی نظموں اور "بھانو سنگھ" کے گیت کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۸۸۵ء سنہ راجہ رام موہن رائے پر بھارتی میں ایک مضمون لکھا۔ اپنے بھائی کے زیر ادارت رسالے بالکا کے لیے سال بھر میں بارہ نظمیں، بیس مضامین، سماجی سوالات کے نو خطوط ڈرامائی انداز میں آٹھ ظریفانہ مضامین، ایک طویل افسانہ "تاج اور ولی صفت بادشاہ وغیرہ" ناول کے ذریعے قلمی اعانت کی۔ وشنو شعرا کی نظموں کا گلدستہ، تبصروں اور تنقیدوں کا مجموعہ اور "ربی چایا" نظموں کے مجموعے شایع کیے۔ چند دنوں کے لیے باندرا اور شولا پور میں قیام کیا۔

۱۸۸۶ء سنہ ان کی پہلی لڑکی مدھوری لتا پیدا ہوئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں جس کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی، افتتاحی نظم پڑھی۔

۱۸۸۷ء، ۸۸ سنہ فلسفہ تعطل پر مضمون لکھا۔ نظموں کا مجموعہ "کیستی کا آغاز" ہوا۔ "جیتھی پترا" "پرانے فیشن کے دادا اور نئے فیشن کے پوتے" کے خطوط شایع ہوئے۔ "سمے لوچنا" تنقیدی مضامین کا مجموعہ اور ایک غنائی ڈراما "فریب کا تکمیل" طبع ہوا۔ اپنے خاندان کے ساتھ غازی پور میں قیام کیا۔ ان کے بیٹے رتھندرناتھ پیدا ہوئے۔

۱۸۸۹ء۔ ڈراما راجہ اور رانی کی اشاعت و پیش کشی عمل میں آئی۔

۱۸۹۰ء۔ دوسرا سفر۔ ڈراما قربانی لکھا جس کو ان کے افراد خاندان نے پیش کیا۔ اپنے اسٹیٹ کے نگران کار مقرر کیے گئے۔ شانتی نکیتن میں قیام کیا۔ کالی داس کی کتاب میگھ دوت پر نظم لکھی اور ستیندر ناتھ کے ساتھ فرانس اور اٹلی ہوتے ہوئے انگلستان گئے اور واپسی پر شیلڈا میں قیام کیا جہاں ان کی دوسری لڑکی رینوکا دیوی پیدا ہوئی۔

۱۸۹۱ء۔ یورپ جاتری کی ڈائری، اور پوسٹ ماسٹر افسانہ دونوں ہفتہ وار رسالے ہتیا بدلی میں شایع ہوئے۔ شاعر کے زیر ادارت ایک ماہ نامہ سادھنا کا اجرا عمل میں آیا۔ مختلف افسانے، سیاسی مضامین اور تبصرے شایع ہوئے۔ شانتی نکیتن مندر کا افتتاح کیا۔

۱۸۹۲ء۔ بے قافیہ ڈراما چترا شایع کیا، اور سادھنا میں موجودہ نظام تعلیم پر پہلا تنقیدی مضمون جدید تعلیم کی فریب آمیزیاں، شایع ہوا جس میں مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ نظموں کا مجموعہ سنہری کشتی چھپی جس کی بعض نظمیں انگریزی میں باغبان اور مفرور میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی میرا دیوی پیدا ہوئی۔

۱۸۹۳ء۔ زمیں داری کاروبار کے سلسلے میں اڑیسہ میں قیام کیا۔ انگریز اور ہندوستانی کے نام سے ایک مقالہ لکھ کر پڑھا۔

۱۸۹۴ء۔ سادھنا میں مضمون انگریزوں کا خوف شایع کیا جس میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا۔ منظوم ڈراما وداعی سلام پر لعنت، طبع ہوا۔ بنکم چندر چیٹرجی پر ایک مضمون سپرد قلم کیا، اور لوگوں کی نظمیں جمع کرنے اور ان پر لوگوں کی توجہ کو مرکوز کرنے کی تحریک شروع کی۔ اپنی تقریظ کے ساتھ ڈی۔ ایل رائے کا تعارف کرایا۔ حیات اور فنون لطیفہ کے مضامین کا سلسلہ بھارتی میں چھپا۔ یہ مضامین بعد کو عناصر خمسہ کی ڈائری کے نام سے چھپے۔ سب سے چھوٹے لڑکے سمندر ناتھ پیدا ہوئے۔

۱۸۹۵ء۔ مختصر افسانوں کا سلسلہ شروع کیا جن کی ابتدا بھوکے پتھر سے ہوئی۔

۱۸۹۶ء۔ نظموں کے تین مجموعے چترا، ندی اور آخری فصل، شایع کیے۔ ایک نظم شاعر کی حیات لکھی۔ کاروبار کے سلسلے میں اڑیسہ گئے اور دوران سفر میں غنائی ڈراما مالینی تصنیف کیا، اور اپنی کلیات نظم دکھیا گرنا تھ ولی، پر نظر ثانی کی جس کو ستیا پرشاد گنگولی نے شایع کیا ہے۔

۱۸۹۷ء۔ طربیہ ڈراما صحیفہ جنت، منظوم ڈرامے گندھاری کی اپیل، ستی اور دوزخ کی سیر شایع ہوئے۔

۱۸۹۸ء۔ شاعر مرض ورم اعصاب میں مبتلا ہو گیا اور شملہ گیا اور واپسی پر بھارتی کی سال بھر میں پندرہ نظموں چھ سیاسی اور سماجی، چار مذہبی اور تعلیمی بارہ ادبی مضامین اور سات افسانوں اور ایک منظوم ڈراما لکشمی کی آزمائش سے قلمی اعانت کی۔ حکومت کی رجعت پسند پالیسی کے خلاف احتجاجی مضامین لکھے، بال گنگا دھر تلک کی گرفتاری کی مذمت کی اور تلک کے بچاؤ کے فنڈ میں عملاً حصہ لیا۔

۱۸۹۹ء۔ کلکتے میں پلیگ نمودار ہوا، اور شاعر نے پلیگ ریلیف میں اپنی بہن کا ہاتھ بٹایا۔

۱۹۰۰ء۔ مختصر ظریفانہ اور بذلہ سنج نظموں کا مجموعہ

کنیکا، اور تاریخ ہند سے متعلق اور بہادر۔ محبان وطن کے منظوم افسانے کتھا کے نام سے شایع ہوئے۔ مختصر نظموں کا مجموعہ کشنیکا، ڈرامہ، ناول کشوارہ کا کلیپ اپنی بھتیجی کی فرمائش پر بنگالی زبان میں بھارتی کے لیے لکھا۔ بڑی بیٹی مادھوری لتا کی شادی سرت چندر چکرورتی سے ہوئی اور شاعر نے شانتی نکیتن میں پہلا قدم رکھا۔

۱۹۰۱ء شنکر چندر چٹرجی کے رسالے بنگا درشن کی ادارت کی۔ ناول چوکھیر بالی (آنکھ کا کانٹا) نظموں کے مجموعے نے بے دیا، اور نیویدیہ میں شایع ہوئے یہ نظمیں روحانی خیالات سے لبریز ہیں۔ رنیوکا دیوی کی شادی ڈاکٹر ستیندر ناتھ بھٹاچاریہ سے ہوئی۔ مستقل طور پر شانتی نکیتن میں قیام کیا اور برہماچاریہ آشرم (مدرسہ) کی بنیاد رکھی۔

۱۹۰۲ء۔ شاعر مالی مشکلات میں مبتلا تھا بیوی کے زیورات اور پوری کے مکان کو فروخت کر دیا۔ لارڈ کرزن کے مشرقی تہذیب پر حملوں کا جو کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں کیے تھے بنگا درشن میں دندان شکن جواب دیا۔ اس کی بیوی مرنالنی دیوی کا انتقال ہوا۔

۱۹۰۳ء۔ اسمرن (نظموں کا مجموعہ) شایع کیا۔ رنیوکا دیوی (لڑکی) کا انتقال ہوا۔ دوسرا مجموعہ نظم بچہ، شایع ہوا جس کی نظمیں ہلال (دی کریسنٹ مون) میں شامل ہیں۔ ناول بربادی بنگا درشن میں شایع ہونے لگا۔

۱۹۰۴ء شانتی نکیتن میں ستیش رائے کا انتقال ہوا۔ مدرسے کی شیلاڈا میں عارضی طور پر منتقلی عمل میں آئی۔

پردوہت چندر سین نے کاویہ گرنتھاولی (شاعر کے مجموعۂ نظم) کو نو جلدوں میں ترتیب دیا۔ سیاسی مضامین بادشاہ کے لوگ۔ جیسے کہ بنیسا۔ صداقت کی مثالیں لکھے۔ نصابی کتابیں تصنیف کیں۔ دیہی صنعتوں کے احیا کے لیے جدید تنظیم کا خاکہ ڈالا۔ شیواجی پر نظم لکھ کر جلسہ عام میں سنائی۔ اپنی ایک معرکۃ الآرا سوانح عمری بنگالی زبان میں لکھی۔

۱۹۰۵ء۔ مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور کا انتقال ہوا۔ ماہنامہ بھانڈار، جاری کیا۔ ایک سیاسی مضمون راجا پرجا لکھا۔ ادبی کانفرنس بہرام پور کی صدارت کی اور ملکی صنعتوں کے احیا کی اپیل کی۔ لارڈ کرزن کا تقسیم بنگال کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاعر نے تعمیری عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی اور صورت حال اور اس کا حل۔ پر ٹاؤن ہال میں خطبہ دیا۔ وطنی گیتوں اور صدارتی خطبوں کا طومار بندھ گیا۔ راکھی بندھن کی رسم شروع کی گئی (بنگال کے اٹوٹ اتحاد کے طور پر) شاعر نے اس سلسلے کا بیدھیر بندھن والا مشہور عام گیت لکھا۔

۱۹۰۶ء۔ اپنے اور اپنے دوست کے بیٹے موزم دار کو علم الفلاحت کی تعلیم کے لیے امریکہ بھیجا۔ نظموں کا مجموعہ کھیا شایع کیا۔ بنگالی لٹریری کانفرنس کی صدارت کی۔

۱۹۰۷ء۔ صوبے میں سیاسی انتشار تھا۔ فرقہ وارانہ جھگڑے تھے۔ شاعر نے ان سے علیحدگی اختیار کی۔ مرض اور اس کا علاج، کے عنوان سے پرباسی ماہنامے میں

مضمون شایع کیا۔ ناول گورا، اسی اخبار میں چھپا۔
نظم آروبندو کا رابندر کی تجویز تسلیم کرنا، شایع ہوئی۔
میرا دیوی کی ناگیندر ناتھ گنگولی سے شادی ہوئی
اور سمندر ناتھ کا انتقال ہوا۔
۱۹۰۸ء۔ بنگال صوبائی کانفرنس کی صدارت کی۔
راستہ اور زاد راہ، پر خطبۂ صدارت دیا۔ بعض
لوگوں کی سیاسی اسیری پر حکومت کی مذمت کی۔
جشن خزانی، ڈراما شانتی نکیتن میں پیش کیا گیا۔
۱۹۰۹ء۔ ڈراما تاوان، لکھا۔ رتھیندر ناتھ امریکہ سے
واپس ہوئے اور شاعر نے مع خاندان کے کشتی پر سفر کیا۔
۱۹۱۰ء۔ گیتانجلی کی نظموں کا ظہور ہوا۔ شانتی نکیتن میں
'تاوان' کی پیش کشی ہوئی۔ رتھیندر ناتھ کی پرتیما دیوی
سے شادی ہوئی۔
۱۹۱۱ء۔ شاعر کی پچاسویں سالگرہ کا جشن شانتی نکیتن میں
منایا گیا۔ ڈراما بادشاہ، کھیلا گیا۔ خود نوشت سوانح
پرباسی میں شایع ہوئی۔ شاعر کی نظموں کا پہلا انگریزی
ترجمہ ماڈرن ریویو، میں لوکن پیالٹ نے کیا جس کا
عنوان زہ نارسا، ہے اور انگریزی میں افسانوں کے
ترجمے بھی شایع کیے۔
۱۹۱۲ء تیسرا سفر۔ بنگال لٹریری اکاڈمی نے شاعر کی جوبلی
منائی اور ٹاؤن ہال میں شاعر کو اڈریس پیش
کیا۔ شاعر نے مشہور قومی گیت جانا گا نامانا، لکھا۔
تحقیقی مقالہ تاریخ ہند پر میری تشریح، ڈراما
قصر قدامت پسندی، اور ڈاک گھر شایع ہوئے۔
گیتانجلی کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ رتھیندر ناتھ

اور پرتیما کے ساتھ انگلستان کو روانہ ہوا۔ روتھین
اسٹین نے نظمیں سنیں اور شاعر کو اپنے گھر پر ادیبوں
اور شعرا کے ایک بڑے مجمع میں مدعو کیا۔ ڈبلیو بی ییٹس نے
ٹیگور کا تعارف کرایا۔ شاعر کے اعزاز میں ادارہ دی نیشن
میگزین والوں نے ایک بڑی ضیافت ترتیب دی۔ انڈین
سوسائٹی لندن نے گیتانجلی شایع کی جس کی خصوصیت
ڈبلیو، بی، ایٹس کا مقدمہ اور روتھین اسٹین کے
قلم سے شاعر کی تصویر تھی۔ لندن سے امریکہ گیا اور
اربانا سے ہوتا ہوا شکاگو پہنچا۔ شکاگو یونیورسٹی میں
ہندوستان کی قدیم تہذیب کا تصور، پر تقریر کی۔
راچسٹر کی ریلیس کانگریس میں شرکت کی اور مضمون
کانفلکٹ، پڑھا۔
۱۹۱۳ء۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں لکچر دیے جو سادھنا میں
چھپے۔ لندن واپس ہوا۔ میکمیلن کمپنی نے گیتانجلی کا
مشہور ایڈیشن شایع کیا۔ ہندوستان واپس ہوا۔ نوبل
پرائز کی اطلاع ملی۔ کلکتہ یونیورسٹی نے ڈی۔ لٹ کی
اعزازی ڈگری پیش کی۔ میکملن کمپنی نے باغبان، ہلال
اور چترا شایع کیے۔
۱۹۱۴ء۔ ۱۹ر جنوری کو گورنمنٹ ہاؤس میں لارڈ
کارمائکیل گورنر بنگال نے نوبل پرائز پیش کیا۔ ڈبلیو،
پیرسن، سی ایف۔ انڈریوز اور نند لال بوس
شانتی نکیتن آئے۔ ڈراما اچلا ئتن پیش کیا گیا۔
سبوج پتر ماہ نامے کے لیے شاعر افسانے، نظمیں اور
مضامین لکھے۔ رام گڑھ اور الہ آباد کا سفر کیا،
جہاں اس نے نظم شاہ جہاں لکھی۔ آگرہ، دارجیلنگ

اور شیلڈا کا سفر کرکے واپس ہوا۔ ایک کتا [illegible] ناٹک لکھے تو [illegible] میکملن کمپنی نے [illegible] ڈاک گھر، اور سادھنا شایع کیے۔

۱۹۱۵ء۔ گاندھی جی کے مدرسے کے طلبا شانتی نکیتن آئے۔ گاندھی جی اور کستوری بائی بھی شانتی نکیتن [illegible] شاعر کے [illegible] کے قبل آنے [illegible] بہت [illegible] گاندھی جی [illegible] استقبال کیا گیا۔ ڈراما فالگونی لکھا اور اس کو اسٹیج کیا گیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ ہوا اور وہی سائکل آف اسپرنگ شایع کیا۔ لارڈ اور لیڈی کارمائکیل شانتی نکیتن آئے۔ نظم بلاکا اور چتورنگا بھی اس کا انگریزی میں قید و تنہا ستہ کے نام سے ترجمہ ہوا ہے۔ گھرے بیرے لکھی جس کا انگریزی میں ترجمہ وطن اور دنیا، کے نام سے مطبوعہ پیتر میں شایع ہوا جون میں نائٹ ہڈ کا خطاب ملا۔ کشمیر کا سفر کیا۔ سرینگر میں شکسپیر سوسائٹی کی استدعا پر انگریزی شاعر پر بنگالی سانٹ شکسپیر ٹرسن ٹری والیوم، کے لیے لکھا۔ رام موہن لائبریری میں ذریعۂ تعلیم پر خطبہ دیا۔

۱۹۱۶ء۔ جوڑا سانکو ہاوس میں سالگوتی کا پیش کش کیا گیا۔ انڈین پبلشنگ ہاوس نے کبیا گرنتھاولی کو دس جلدوں میں شایع کیا میکملن کمپنی نے فروٹ گیدرنگ اور بھوکے پتھر اور دیگر افسانے شایع کیے (چوتھا سفر) ۳ مئی کو جاپان کے لیے روانہ ہوا۔ رنگون، کوبے، ہوکون میں قیام کیا۔ ٹوکیو اور کیو گیجیگو یونیورسٹی میں اپنی تقریروں میں ظالمانہ حکومت اور شہنشاہانہ پالیسی کی مذمت کی۔ سرکاری جاپانی عہدہ داروں میں بددلی پیدا ہوگئی (یہ لکچر قومیت میں شامل ہیں) امریکہ روانہ ہوا ہر جگہ قومیت پر لکچر دے دیے جن میں شہنشاہیت کے نظام کی مخالفت کی ہے۔ بوسٹن اور ایل یونیورسٹی میں تقریریں کیں جو فنون لطیفہ، تعلیم اور شخصیت کے بارے میں ہیں اور بعد کو شخصیت میں شایع ہوئیں۔

۱۹۱۷ء۔ جاپان کو واپس ہوا، اور ہونولولو میں قیام کیا۔ ہندوستان واپس آگیا۔ اینی بیسنٹ کی نظر بندی پر احتجاج کیا۔ الفریڈ تھیٹر میں سیاسی خطبہ مالک جو چاہے، کے عنوان پر دیا۔ کانگرس کے جلسے میں ایک نظم ہندوستان کی دعا، سنائی۔ میکملن کمپنی نے شاعر کی خود نوشت سوانح، قربانی اور دوسرے ڈرامے وحی سائکل آف اسپرنگ، شخصیت اور قومیت شایع کیے۔

۱۹۱۸ء۔ ای۔ یس۔ مانٹیگو وزیر ہند نے شاعر سے ملاقات کی تعلیمی کمیشن کے ارکان سر مائکل سیاڈلر وغیرہ کے سامنے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی۔ حکومت ہند کی تعلیمی پالیسی پر ذو معنی ہجویہ نظمیں لکھیں۔ طوطے کی تربیت، اور پلاتکا اسی کا اظہار ہیں۔ پیرسن کی چین میں گرفتاری عمل میں آئی۔ مدھوری لتا کا انتقال ہوا بھارت وشوابھارتی کا سنگ بنیاد رکھا۔ میکملن کمپنی ہند نے لورس گفٹ اینڈ کراسنگ اور ماشی اور دیگر کہانیاں اور میکملن کمپنی نیویارک نے گیتانجلی، فروٹ گیدرنگ

اور ٹیگور کی کہانیاں شایع کیں۔

۱۹۱۹ء جنوبی ہند کا سفر کیا۔ بنگلور اور میسور میں "جنگل کا پیام" پر تقریریں کی۔ اوٹی، کوئمبتور، سیلم، ترچنا پلی، مدورا گیا، اور مدراس میں اینی بسنٹ کا مہمان رہا۔ امپائر تھیٹر کلکتہ میں تعلیم پر پہلی دفعہ انگریزی زبان میں تقریر کی (کلکتے میں)۔ شانتی نکیتن نیوز کا جاری کیا، اور "بی بی کا" لکھنے لگا۔ ۱۳/اپریل کو جلیان والا باغ کا افسوس ناک حادثہ ہوا اور اس سے متاثر ہو کر ۳۰/مئی کو اپنا نائٹ ہڈ کا خطاب احتجاجاً واپس کر دیا۔ شانتی نکیتن میں اعلیٰ تعلیم کا آغاز ہوا۔ ڈراما "پیار اور ت ساب" کا پیش کش کرنے کے بعد اکتوبر میں شلانگ اور دسمبر میں سلہٹ گیا۔

۱۹۲۰ء (پانچواں سفر یورپ)۔ مغربی ہندوستان کا سفر کیا۔ احمد آباد۔ بھاؤنگر۔ لمبڈی۔ بڑودہ، سورت اور احمد آباد ہوتا ہوا شانتی نکیتن واپس ہوا۔ ۱۱/مئی کو انگلستان کے لیے روانہ ہوا۔ لندن۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں اپنے پرانے ملاقاتیوں سے ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ شاعر کی برطانوی حکومت پر تنقید سے متاثر ہو کر بیگانگی برت رہے ہیں۔ اس نے فرانس میں برگساں، سلوین لیوی اور دیگر ادیبوں سے ملاقات کی۔ جنگ عظیم کا میدان کارزار بھی دیکھا۔ ہالینڈ، ہیگ اور لیڈن یونیورسٹی میں تقریریں کیں۔ اینٹورپ اور بروسلز بھی گیا جہاں شاہ بلجیم سے ملاقات کی۔ پھر انگلستان سے ہوتا ہوا امریکہ پہنچا اور موسیقی کی بروکلین اکاڈمی میں "مشرق و مغرب کا ملاپ" پر اور نیویارک کے کارنیگی ہال میں [illegible] پر [illegible]

اور پھر انگلستان واپس ہوا۔

۱۹۲۱ء انگلستان سے پیرس گیا اور رومین رولاں سے ملاقات کی۔ [illegible] میں لکچر دیے۔ اسٹرابرگ یونیورسٹی میں "پیام صحرا" پر جنیوا میں تعلیم پر، لومبرفی ماباس اور زیورچ کی جامعات، روسو انسٹیٹیوٹ، ہیمبرگ، کوپن ہیگن وغیرہ میں مختلف عنوانوں پر تقریریں کیں۔ کونٹ کیسرلنگ کے ساتھ مقیم رہا۔ پھر سویڈن گیا جہاں شاہ سویڈن نے عوام کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اس کے اعزاز میں سویڈش اکاڈمی کی جانب سے شاہی ضیافت ترتیب دی گئی۔ واپسی میں برلن اور میونخ میں تقریریں کرتا اور جہاں بنگالی نغمے سناتا اور آنکھ فورٹ دیا اور پیریا ک سے ہوتا ہوا ۱۶/جولائی کو بمبئی پہنچا اور شانتی نکیتن کی راہ لی۔ ۔۔۔۔ کلکتے میں تمدنوں کے ملاپ اور تحریک عدم تعاون پر تنقید کی جس سے ادبی مباحثے چھڑ گئے۔ مشہور بنگالی ناول نگار سارت چندر چٹر جی نے تمدن کا اختلاف لکھ کر ٹیگور کی تقریر کا جواب دیا۔ کلکتہ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ کے عام جلسے میں شاعر نے اس کا جواب "سچ کی پکار" کے عنوان سے دیا۔ شاعر کا جواب گاندھی جی نے اخبار "ینگ انڈیا" میں "پاسبان اعظم" لکھ کر دیا۔ پہلی دفعہ شانتی نکیتن میں برسا منگل (موسیقی کا جشن برشا کالی) منایا۔ گاندھی جی بیتین اور ایل کے ایمہرسٹ شانتی نکیتن آئے۔ شاعر سے ملاقات کے لیے

یورپ سے آنے والوں میں لیوی وہ شخص ہے جس نے چینی اور تبتی تحقیقات کی تنظیم میں مدد دی۔ وشوابھارتی کا افتتاح ہوا۔ شاعر نے اپنی زمینات، عمارات، کتب خانہ اور شانتی نکیتن میں اپنی ملکیت کی اشیا وشوابھارتی کو دے دیں۔ ڈراما آبشار لکھا، اور میکیلن نے مفرور اور بنگال کی جھلکیاں طبع کی۔

۱۹۲۲ء۔ سری نکیتن میں مدرسہ دیہات سدھار کا افتتاح کیا۔ جنوبی ہندوستان، بمبئی۔ پونا۔ بنگلور۔ میسور۔ ٹراونکور۔ کوچین۔ لنکا اور مدراس کا دورہ کیا۔ سی سو بھولاناتھ، پر نظم لکھی۔ میکیلن نے تعمیری اتحاد شایع کیا۔

۱۹۲۳ء۔ سندھ۔ حیدر آباد اور کاٹھیاواڑ کا دورہ کیا۔ ۱۹۲۲ء تک کی شایع شدہ تصانیف کا حق وشوابھارتی کو دیا۔ گرما شیلانگ میں گذرا۔ ڈراما سرخ سدا بہار، لکھا، وشوابھارتی سہ ماہی رسالہ اپنی ادارت میں نکالا۔ پیرسن کا اٹلی میں ریل کے حادثے سے انتقال ہوا۔ ہندوستانی دیسی ریاستوں کے دورے پر گیا تاکہ وشوابھارتی کے لیے چندہ جمع کرے۔

۱۹۲۴ء۔ چھٹا سفر، یونیورسٹیز الینس چین کے صدر لیانگ شی شاؤ کی دعوت پر چین گیا مجموعہ تقاریر چین میں چین کی سب تقریریں چھپیں۔ شانگھائی۔ نانکن پیکن، تے یوآن فو۔ ہانگ کانگ اور جاپان سے ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔ لارڈ لٹن نے بنگالی عورتوں پر جو حملہ کیا اس کا دنداں شکن جواب دیا۔

(ساتواں سفر)۔ خود مختاری جمہوریت پیرو کی صد سالہ سالگرہ کی دعوت پر ایلمہرسٹ کے ساتھ جنوبی امریکہ گیا لیکن بحری سفر میں بیمار ہونے سے بیونس آیرس، پر اتر گیا۔ پورَبی، ایک نظم لکھی۔

۱۹۲۵ء۔ ۴ر جنوری کو امریکہ سے روانہ ہوا اور ۲۱ر کو جینوا پہنچا۔ وینس اور میلان میں موسیقی پر لیکچر دیے اور بیمار ہو کر ہندوستان آگیا۔ جیوتریندر ناتھ نے اور سیاسی ادیب سی۔ آر۔ داس نے انتقال کیا۔ ان کی تعزیت کے جلسے میں ایک نظم سنائی۔ گاندھی جی ملنے کے لیے آئے۔ گاندھی جی کے چرخے کے مسلک پر اپنے مضمون سوراج سادھن میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ چرخے کا استعمال سوراج کے لیے بے سود ہے۔ اٹلی کے پروفیسر کارلو فارمیچی نے اٹلی سے آکر ملاقات کی اور اطالوی زبان کا کتب خانہ بھی اپنے ساتھ لایا۔ لارڈ لٹن، شانتی نکیتن آئے۔ پہلی فلوسافیکل کانگریس کے جلسے کی صدارت کی۔

۱۹۲۶ء۔۔۔۔۔ فنون لطیفہ کے فلسفے پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں تقریر کی۔۔۔۔۔ لکھنؤ کل ہند موسیقی کانفرنس میں شرکت کی اور مشرقی بنگال کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتا ہوا آبھیا آشرم کے صد سالہ جشن کی صدارت کے لیے۔ کومیلا، آیا۔

(آٹھواں سفر)۔ مہاراجہ پوربندر نے کلا بھون (آرٹ اسکول) کا عطیہ پیش کیا۔ دعوت ناموں سے مجبور ہو کر رو بہ صحت ہونے کے بعد شاعر اٹلی گیا۔ روم میں مسولینی نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے

فاشزم پر تقریر کرنے سے انکار کیا۔ روم کے گورنر نے اس کے اعزاز میں شاہی ضیافت ترتیب دی۔ برطانوی سفیر نے چائے پر مدعو کیا۔ اطالوی زبان میں چترا پیش کیا گیا۔ ایک یونیورسٹی کا سپاس نامہ قبول کیا۔ یہاں سے فلارنس کی راہ لی۔ لیونارڈو اور داونسی سوسائٹی نے شاعر کے اعزاز میں جلسہ کیا۔ ٹیورن سے ہوتا ہوا سوئٹزرلینڈ پہنچ کر دو ہفتے آرام لے کر مانٹریاکس پہنچا اور یہاں سے ذریعہ موٹر ویلینی وی پہنچ کر بائرون ہوٹل میں قیام کیا۔ اسی کمرے میں قیام تھا جہاں وکٹر ہیوگو ایک زمانے تک رہ چکا تھا۔ سامنے جھیل اور اس کے پس منظر میں قصر شیلان۔ یہاں رومین رولان نے شاعر کا استقبال کیا اور قیام تک طویل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جارج دوہمل، جیمس فریزر اور پروفیسر فوریل سے ملاقات کی۔ اس نے یہاں ایک ممتاز جلا وطن پروفیسر کی بیوی سنورا سالویڈوری سے بھی ملاقات کی جس نے فاشزم پر ابتدائی معلومات شاعر کو بہم پہنچائیں جس کی بنا پر شاعر نے مانچسٹر گارڈین کے نام خط لکھا کہ وہ مظالم کے ارتکاب کو مستحسن سمجھنے والے نظام حکومت کی مذمت کرتا ہے۔

اس سے اطالوی مخالف ہو گئے۔ وہ ویانا اور پھر ناروے گیا جہاں شاہ ناروے نے استقبال کیا۔ کوپن ہیگن اور ہیمبرگ سے برلن آیا جہاں ہنڈن برگ صدر جمہوریہ نے ملاقات کی۔ ڈریسڈن، کولون، پریاگ، بلغراد، صوفیہ، بخارسٹ، ایتھنز اور قاہرہ ہوتا ہوا دسمبر میں شانتی نکیتن واپس ہوا۔

۱۹۲۷ء نواں سفر۔ ایک رقصی ڈراما نٹا راجا لکھا۔ بھارت پور میں ہندی لٹریری کانفرنس کی صدارت کی۔ چندر ناگور میں بر بازنک سنگھا کی عبادت گاہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ شیلانگ کے قیام کے دوران میں اپنے ناول "تین نسلیں" کی تکمیل کی۔ سنگاپور جا کر مختلف عنوانات پر تقریریں کیں۔ پینانگ سے بوٹویا پہنچا، اور انگریزی میں جاوا پر نظم پڑھی۔ بالی جاتے ہوئے سرابایا میں ایک جلسے کی صدارت کی۔ اس کے بعد وہ وسطی جاوا گیا۔ یہ ملک دارسنٹی اور لیا تڈن دو شہزادوں، سوپراکرتا اور ویجوجاکرتا کے ملک کہلاتے ہیں۔ وہ دونوں شہزادوں کے پاس مقیم رہا، جہاں اس نے بہترین رقص دیکھے اور کاملان فن سے ملاقات کی۔ اس نے یہاں ہندوستانی فرقہ واری مسئلے کے حل پر تقریر کی۔ سیام (تھائی لینڈ) کی دعوت پر بنکاک گیا، اور قومی تعلیم کے تصور پر تقریر کی۔ ۲۷ اکتوبر کو کلکتہ آ گیا۔ سیملن نے فانٹر نلائٹر اور دوست کے نام خطوط شائع کئے۔

۱۹۲۸ء مئی میں آدیار گیا، وہ اینی بسنت کا مہمان رہا۔ پانڈیچری میں آروبندو گھوش سے ملتا ہوا سیلون گیا۔ واپسی میں بنگلور میں قیام کرتا ہوا کلکتہ آ گیا، اور اگست میں برہمو سماج کے صد سالہ جشن کے موقع پر رام موہن رائے کے پیام پر ایک بسیط مضمون پڑھا۔ نومبر میں لارڈ ارون نے

شانتی نکیتن میں شاعر سے ملاقات کی۔ ماہا کی اشاعت عمل میں آئی۔

۱۹۲۹ء۔ دسواں سفر، کناڈا کی نیشنل کانفرنس کی دعوت پر نیشنل کانفرنس میں شرکت کے لیے وانکوور ہوتا ہوا کناڈا پہنچا اور تعطل کے فلسفے پر تقریر کی۔ ہارورڈ، کولمبیا اور دوسری جامعات کی دعوت قبول کی۔ لاس انجلس میں شاعر کا پاسپورٹ گم ہو گیا، اور وہاں کے محکمہ راہداری کے افسروں سے ناراض ہو کر واپس جاپان آگیا، اور انڈوچائنا سے ہوتا ہوا کلکتہ پہنچا۔ شاعر کی دعوت پر مسٹر ٹاکاگاکی شانتی نکیتن آئے تاکہ طلبا کو حسن کاری سکھائیں۔

۱۹۳۰ء۔ گیارھواں سفر، مغرب کی طرف۔ ہیجان زیادہ۔ ہا جنوری میں بڑودا گیا اور انسان بہ حیثیت حسن کار پر تقریر کی۔ کولمبو سے ہوتا ہوا مارسیلز گیا، اور مانٹی کارلو کے قریب کیپ مارٹن میں ٹھیرا۔ زیکوسلوا کیا کے صدر ماسارک سے ملاقات کی۔ پیرس آنے پر اس کی تصویروں کی نمائش کی گئی۔ لندن سے ہوتا ہوا برمنگھم پہنچا اور تہذیب اور اس کا ارتقا پر تقریر کی۔ ہندوستان سے گاندھی جی کی گرفتاری، بنگال میں ظلم و ستم، شولاپور میں مارشل لا کا نفاذ اور دوسرے احکامات سن کر بے چین ہو گیا، اور میانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار سے برطانوی حکومت کی اس تشدد آمیز پالیسی کی مذمت کی۔ آکسفورڈ میں ہبرٹ لکچرز دیے جو بعد کو آلین اینڈ ان وِن نے مذہب انسان کے نام سے شایع کیے۔ ڈارٹنگٹن ہال (ڈیون شائر) میں ایلمہرسٹ کی تعلیمی آبادی کا معاینہ کرتا ہوا برلن پہنچا جہاں گیلری مالز میں اسی کے تصویروں کی نمائش کی گئی تھی۔ ڈریسڈن اور میونخ ہوتا ہوا ڈنمارک گیا جہاں تصویروں کی نمائش منعقد کی گئی تھی۔ روسی حکومت کی دعوت پر ۱۱ ستمبر کو ماسکو پہنچا۔ روس کے بڑے بڑے ادیبوں اور حسن کاروں سے ملاقات کی۔ مصور اور شاعر ہر دو حیثیتوں سے بڑے بڑے جلسوں کی صدارت کی، یہاں خواتین کے جلسے میں بھی صدارت کی اور اپنا مشہور گیت جانا مانا گانا سنایا۔ بے گنتی اداروں، میوزیم اور مدارس کا معاینہ کیا۔ ۲۴ کو اپنی وداعی تقریر میں روسی تاثرات بیان کیے۔ اسی جلسے میں ایک روسی شاعر شنگی نے ٹیگور پر ایک نظم پڑھی۔ روس کے مشہور مصنف گالیرن نے ٹیگور کی تین نظموں کا روسی زبان میں ترجمہ سنایا۔ روس کے ایک مشہور اداکار نے ڈاک گھر کے چند حصے پیش کیے۔ ۲۵ ستمبر کو ماسکو سے نکل کر برلن سے ہوتا ہوا امریکہ پہنچا۔ پریذیڈنٹ ہوور نے واشنگٹن میں شاعر کا استقبال کیا۔ بوسٹن اور نیویارک میں حسن کاری کی نمائشیں ہوئیں۔ ۲۲ دسمبر کو انگلستان واپس ہو گیا۔

۱۹۳۱ء۔ ایک رقصی ڈراما تاین واپسی میں لکھا۔ رابندر چھبی کے نام سے روس سے آئے ہوئے خطوط

شایع کیے۔ شانتی نکیتن میں سترھویں سالگرہ منائی گئی۔ نواب صاحب بھوپال کی دعوت پر بھوپال گیا۔ جتنی سوتر تھا، شایع کی۔ سنسکرت کالج کے پنڈتوں نے کوی سروابھوما، کا خطاب دیا۔

۱۹۳۲ء۔ ۵ جنوری کو جینتی کے جلسے گاندھی جی کی گرفتاری کی وجہ سے بند کر دیے گئے۔ یہ گرفتاری گول میز کانفرنس کے کچھ دن بعد ہی عمل میں آئی تھی۔ اس نے طویل بیان بھی شایع کرانا چاہا، لیکن بنگال کے دفتر احتساب نے روک دیا۔ شاعر نے گاندھی جی پر ایک نظم پراسنا یعنے سوال کے عنوان پر لکھی۔ کلکتے میں اس کے آرٹ کی نمائش کی گئی۔

بارھواں سفر۔ ہز مجسٹی رضا شاہ پہلوی سابق شاہ ایران کی دعوت پر طیارے کے ذریعے ایران گیا۔ بوشہر میں گورنر نے شاہی ضیافت ترتیب دی۔ شیراز اور اصفہان ہوتا ہوا طہران پہنچا جہاں اس کی بہت قدر و منزلت کی گئی۔ اخباروں نے اس کو آسمان مشرق کا بڑا درخشندہ ستارہ، کا نام دیا۔ شاعر نے رضا شاہ کی مدح میں ایک نظم لکھی۔ شاعر کے دل پر اس میزبانی کا خاص اثر ہوا جس کا اس نے وداعی تقریر میں بھی اظہار کیا۔ بغداد میں شاہ فیصل والی عراق سے ملاقات کرتا ہوا ۳ جون کو طیارے ہی کے ذریعے کلکتہ آگیا۔ ایک نظم (خاتمہ) پنّا سچا، اور ایک ڈراما کال کر جاترا لکھا۔ گاندھی کے برت سے پریشان ہو کر پونا آیا، اور ان سے یرودا جیل میں ملا۔

پنڈت مدن موہن مالویہ شانتی نکیتن آئے، پی، سی۔ رے کی سترھویں سالگرہ کے جشن کی صدارت کی۔ مہاتما جی اور پست اقوام پر ایک رسالہ لکھا۔

۱۹۳۳ء۔ پوروداؤد رضا شاہ کے حکم پر شانتی نکیتن آئے۔ رام موہن رائے کی صد سالہ برسی کی صدارت کی۔ "بچیترتا" کی نظمیں لکھی۔ شاعر بمبئی گیا اور مختلف مقامات پر تقریریں کیں۔ آندھرا یونیورسٹی میں سرکرشنا سوامی ایر، پر لکچر دیے جو بعد کو انسان کے نام سے شایع ہوئے۔ وجیانگرم سے ہوتا ہوا جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر حیدرآباد آیا۔ پہلے دن شاعر کے اعزاز میں ایک گارڈن پارٹی ترتیب دی گئی تھی۔ اس نے نوجوانوں کے نام ایک پیام پر تقریر کی۔ اس کے اعزاز میں سٹی کالج میں بھی ایک بہت بڑا جلسہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں مسز سروجنی نائیڈو بھی شاعر کے ہمراہ تھیں۔ شاعر نے بنگالی زبان میں ایک نظم سنائی اور ایک تقریر بھی کی۔ دسمبر میں کلکتہ واپس ہوا۔ رام موہن رائے کے صد سالہ جشن اور کل ہند مذاہب کانفرنس میں شرکت کی۔ "مالنچا" ایک ناول شایع کیا۔

۱۹۳۴ء۔ نہرو اور کملا دیوی نے شاعر سے ملاقات کی۔ شاعر کولمبو گیا اور ایک تقریر نشر کی۔ شانتی نکیتن ڈراما پارٹی نے کولمبو میں شاپموچن شاعر کا ڈراما پیش کیا۔ کانڈی، انورادھاپورہ

اور جافنا ہوتا ہوا کلکتہ واپس ہوا۔ دورانِ سفر میں چار ادھیائے (چار فصلیں) ایک ناول لکھا۔ خان عبدالغفار خاں نے شاعر سے شانتی نکیتن میں ملاقات کی اور ایک شاندار جلسے سے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ مدراس گیا اور اس کی مصوری کی نمائش منعقد کی گئی۔ گورنمنٹ ہاوس کلکتہ میں سر جارج اسٹینلی اور لیڈی اسٹینلی نے شاعر کے اعزاز میں ضیافت ترتیب دی۔ بنارس میں راج گھاٹ مانٹیسوری اسکول کا افتتاح کیا۔

۱۹۳۵ء ۔ سر جان انڈرسن گورنر بنگال کا شانتی نکیتن میں خیر مقدم کیا۔ اسی دن دوپہر کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کی صدارت کے لیے روانہ ہوا۔ ۸ر فروری کو یونیورسٹی نے شاعر کی خدمت میں اعزازی ڈی، لٹ کی ڈگری پیش کی۔ ۱۲ر کو وہ الہ آباد آکر یونیورسٹی کے طلبا سے مخاطب ہوا۔ ۱۳ر کو لاہور گیا، اور پنجاب اسٹوڈنٹس کانفرنس میں خطبہ دیا۔ اسی دن وائی، ایم، سی اے میں اپنی نظمیں سنائیں۔ سکھ لیڈروں سے ملاقات کی اور گردوارہ دیکھا۔ ۲۸ر کو لکھنؤ یونیورسٹی میں تقریر کی۔ نومبر میں ملک الشعرا یان یون نگوچی نے شاعر سے ملاقات کی۔ تب 'تھیکا' کی نظم لکھی اور شایع کی۔

۱۹۳۶ء ۔ کلکتے کے سینٹ ہال میں ہفتہ تعلیمی پر تقریر کی۔ ایک رقصی ڈراما 'چترانگادا' لکھا۔ بابو راجیندر پرشاد کی دعوت پر پٹنہ گیا۔ شہریوں نے اڈریس اور وشوا بھارتی کے لیے ایک تھیلی پیش کی جو شاعر کا اصل مقصد تھا۔ الہ آباد اور لاہور ہوتا ہوا دہلی آیا، اور گاندھی جی اور کستوری بائی نے یہاں آکر شاعر سے ملاقات کی۔ ایک گمنام شخص نے ساٹھ ہزار کی رقم پیش کی۔ شہزادی نیلوفر فرحت بیگم نے حیدرآباد ہاوس دہلی میں لنچ پر مدعو کیا۔ وہ میرٹھ جاکر پھر اپنی نظمیں نشر کرنے کے لیے دہلی آیا اور واپس ہوگیا، اور اپنی نظم پریسودھ کو غنائی ڈرامے کی شکل دی۔

۱۹۳۷ء ۔ کلکتہ یونیورسٹی میں خطبہ تقسیم اسناد پڑھا۔ یہ کلکتہ یونیورسٹی کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ ایک آزاد شخص نے خطبہ دیا۔ ایک ایسے شخص نے صدارت کی جس کو سرکاری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چندرنگو میں ادبی کانفرنس کی صدارت کی۔ پارلیمنٹ آف ریلی جنس، کی صدارت کی۔ سینو انڈین سٹڈیز کے لیے چینا بھون کا افتتاح کیا۔ آندھرا کی بھارتی تیرتھا نے کوی سمراٹ، کا خطاب دیا۔ ۱۰ر دسمبر کو اچانک بیمار ہوگیا۔ آل انڈیا کانگریس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کے لیڈروں نے عیادت کی۔ دورانِ صحت یابی میں پرانتک کی نظمیں لکھیں اور انھیں شایع کیا۔

۱۹۳۹ء ۔ سوباش چندر بوس کا استقبال کیا۔ جواہر لال نہرو نے ہندی بھون کا اور کلکتے میں شاعر نے سوا بھارتی سمیلان کا افتتاح کیا جو

کلکتے کا ادبی اور ثقافتی مرکز ہے۔ آڑیسہ کی کانگریسی
حکومت کی دعوت پر پوری گیا۔ شاعر کی اٹھترویں
سالگرہ منائی گئی۔ سبھاش بوس کی دعوت پر
کلکتے میں مہاجاتی سدن کا سنگ بنیاد رکھا۔
جواہر لال نہرو نے چین جاتے ہوئے شاعر سے
ملاقات کی۔ مدنا پور میں ودیا ساگر میموریل کا
افتتاح کیا

۱۹۴۰ء۔ گاندھی جی اور کستوری بائی کا استقبال
کیا۔ پوری اور بنکاپور میں صنعتی نمائشوں کا شاعر کے
ہاتھوں افتتاح ہوا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے
شانتی نکیتن میں ایک خصوصی جلسہ منعقد کر کے شاعر کی
خدمت میں ڈی، لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔
سر ماریس گائر اور سر سروپلی رادھاکرشنن یونیورسٹی
کی نمائندگی کر رہے تھے۔ صحت روبہ انحطاط رہی۔

چینی قومی حکومت کے صدر امتحانات ہز اکسیلنسی تائی شی تاؤ کا
شانتی نکیتن میں استقبال کیا۔ نیا جاتکا، سنائی،
راگ سجائے، اور آروگیا نظموں کے مجموعے لڑکپن کی
خود نوشت سوانح، چھیلے بالا، اور طویل افسانوں کا
مجموعہ تین سنگھی، شائع ہوئے۔

۱۹۴۱ء۔ ۱۴ اپریل کو شاعر کی اسّی ویں سالگرہ
منائی گئی جس میں شاعر نے ایک خطبہ سبھیتا ر سنکٹ میں
اپنا پیام سنایا۔ ۸ مئی کو سارے ہندوستان میں اس کی
سالگرہ منائی گئی۔ مہاراجہ تری پورہ نے بھارت بھاسکر کا خطاب
دیا۔ سالگرہ کے موقع پر اس کی دو کتابیں ایک مجموعہ نظم جنم دائنی اور
مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ گالپا سالپا، چھیلے بالا کا انگریزی
ترجمہ، میرے لڑکپن کے دن، شائع کیے گئے۔
بیماری دن بہ دن بڑھتی گئی اور ۷ اگست کو
شاعر نے انتقال کیا۔

وشوابھارتی

اس مضمون کو سپردِ قلم کرنے کا مقصد اُن انقلابی واقعات کا انکشاف کرنا ہے جن کی بناء پر تدریجاً "شانتی نکیتان آشرم" سے ۲۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کو وشوابھارتی عالمِ وجود میں آئی۔ اس آشرم کے بانی شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور بانی وشوابھارتی کے والد مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور تھے۔ لیکن یہ دونوں ادارے جدید ہندوستان کے بانی راجہ رام موہن رائے آنجہانی کے الہام کی تخلیق ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کے روحانی ادراک کے لافانی ذریعے کا کھوج لگایا اور تعلیم کو توہمات کی داروگیر سے آزاد کر کے اُس کو بنیاد دُہل تلاشِ حق اور بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے اسباب کی چھان بین پر لگایا۔

شانتی نکیتان آشرم ایک کھلی فضا میں واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف اُفق آسمان سطحِ زمین سے ہم آغوش دکھائی دیتا ہے۔ ایک دفعہ سفر کے دوران میں مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور یہاں پہنچے تو اس دلکش اور روح پرور منظر سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ دو درختوں کے زیرِ سایہ جو آشرم کے ایک جانب اب بھی موجود ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کے لئے بیٹھ گئے۔ سنگِ مرمر کا ایک کتبہ اُس مقام پر نصب ہے جہاں مہارشی مراقبہ میں بیٹھے تھے کتبہ پر بنگالی زبان میں مراقبے کا یہ متن کندہ ہے۔

"وہ میری زندگانی کا چین ہے میرے دل کی خوشی ہے اور میری روح کی شانتی ہے۔"

مہارشی نے یہاں ایک مکان اور مندر تعمیر کروایا کہ وہ لوگ جو ذات پات کے جھوٹے جھگڑے اور فرقہ وارانہ کشاکش سے برداشتہ خاطر ہو کر خدا کا دھیان کرنے کے آرزومند ہوں سکون کے ساتھ یہاں اُس کی عبادت کر سکیں۔ اس طرح ایک ٹرسٹ کے تحت مقررہ سالانہ رقم کے ساتھ اُس آشرم کی داغ بیل جو آج ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ڈالی گئی۔

لیکن یہ آشرم اُس وقت مرکزِ توجہ بنا جب دسمبر ۱۹۰۱ء میں رابندر ناتھ ٹیگور نے بچوں کے لئے اس نو آبادی میں ایک مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ قدیم ہندوستان کے ابتدائی مکانات

شاعر کے لئے ہمیشہ توجہ گیر رہے ہیں اور وہ ایک ایسا آشرم قائم کرنے کے متمنی تھے۔ جہاں بچے آزاد فضا میں رہ کر اپنے ماحول کی ہم آہنگی کے ساتھ بقائے قوم میں حصہ لے سکیں اور جہاں تعلیم اُن کو زندگی کے اس مقصد سے دور نہ ہٹا سکے۔ موجودہ طریق تعلیم میں ہندوستانی تمدن کی اصلی روح مفقود ہے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی لافانی روایات کی مضبوط چٹان کو تعلیم کا سنگِ بنیاد بنائیں، بنگالی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیں، ہندوستان کے روایاتی ادب اور آرٹ اور موسیقی کے موروثی خزائن سے اکتساب الہام کریں۔ بنگال کے باہمت ماہرین تعلیم نے صدیوں کے جمود کے توڑنے اور تقلیدی طریقۂ تعلیم کے خلاف، جس کو قوم کی عملی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے اور شاعر کے نصب العین کو کامیاب بنانے میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ اور بارہ سال تک صبر و استقلال کے ساتھ معاشی اور معاشری محرومیوں کو جو ہر بانی کی قسمت ہے برداشت کیا۔

بعد میں ایک اہم تبدیلی ہوئی سنہ ۱۹۱۳ء میں شاعر یورپ گیا وہاں بھی اس کو مدرسے کی مصروفیتوں کے وسیع کرنے کی ضرورت کا احساس تھا اس لئے وہ ایک خط میں لکھتا ہے:۔

"ہمارے سارے شک و شبہات خود بخود رفع ہو جائیں گے اگر ہم اپنے ادارے کو کل عالم کی روشنی میں سنواریں۔ ..... کامل انسان کی نشو و نما ہمارا نصب العین ہے، اور اس سے کمتر شئے کو کبھی بھی منتہائے مقصد نہ قرار دینا چاہیئے۔"

سنہ ۱۹۱۴ء میں سی، ایف اینڈریوز اور ڈبلیو ڈبلیو پیرسن، شانتی نکتیاں کے کام میں شاعر کا ہاتھ بٹانے اور اُس کی مدد کرنے کے لئے اُس کے ساتھ ہندوستان آئے۔ انھوں نے نئے تصورات پیش کئے اور طے پایا کہ مدرسہ کو اب اسقدر وسعت دینی چاہیئے کہ نہ صرف بچوں کو اُس میں شریک کیا جائے۔ بلکہ ہندوستان کے ہونہار نوجوانوں کو بھی داخل کیا جائے۔

اس دوران میں دوسری سمت بھی ترقی ہوتی رہی ابتدا ہی سے شاعر کو اس امر کا احساس تھا کہ تعلیم کو عوام کی معاشی زندگی سے قریبی طور پر متعلق ہونا چاہیئے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں اُس نے موضع سورولی میں ایک بڑا مکان اور اس سے ملحقہ ۸۰ ایکڑ زمین خریدی۔ اور یورپ سے واپس ہونے کے بعد اس نے زراعت، پرورش جانوران اور دیہات سُدھار کاموں کا تجربہ شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد امریکہ میں شاعر کی ملاقات ایک نوجوان انگریز ایل کے۔ اِلمہرسٹ سے ہوئی جس نے دیہات سدھار کو ترقی دینے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ پیشکش نہایت بروقت تھا اور مسٹر و مسز اِلمہرسٹ کی فراخ دلی و شوابھارتی کے شعبۂ دیہات سدھار کی غیر معمولی ترقی اور کارکردگی کی ذمہ دار ہے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں شاعر نے جاپان اور امریکہ کا سفر کیا جہاں اُس نے قومیت پر تقریریں کیں۔ اس سفر کے دوران میں اُس کو ایک ایسے ادارے کی ضرورت کا شدید احساس ہوا جو مشرقی تمدن کا حقیقی مرکز ہو۔

۲۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کو طلبائے حال، اساتذہ، سابق طلباء اور بہی خواہوں کے ایک خاص جلسے میں اُس نے وشوابھارتی (عالمی جامعہ) کے تخیل کی وضاحت کی اور اسکو مشرق کے مختلف تمدنوں اور اُن کے پرچار کا ایسا مرکز بنایا جہاں قدیم علوم کی دولت کو جدید انسانیت کے ساتھ ہم آہنگ بنا کر پیش کیا جائیگا۔ اس کا نام وشوابھارتی وید کے حسب ذیل جملے سے لیا گیا ہے:-

"جہاں تمام دنیا ایک ہی گھونسلے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔"

۱۹۱۹ء کے بعد ہی ..... سنسکرت، پالی تبتی اور دوسری مشرقی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم کا باضابطہ انتظام کیا گیا اور یورپ کی جدید و قدیم زبانوں کے مطالعے کے لئے بھی ایک شعبہ کھولا گیا۔ شاعر نے دوبارہ یورپ کا دورہ کیا اور اس موقع پر وشوابھارتی کا نصب العین تحصیل علم میں مشرق اور مغرب دونوں کی رفاقت اور نسل انسانی کے روحانی اتحاد کی کوشش شامل ہے، کما حقہٗ واضح ہوا۔ اور مغرب کے سربرآوردہ علماء مثلاً فرانس سے سلوین لیوی چکوسلواکیا سے ونٹرنیز اور لزنی ناروے سے اسٹن کونا ؤ نے ہندوستان آنے کی دعوت قبول کر لی اور بعد کو دورہ کناں پروفیسروں کی حیثیت سے اس کے کام میں شریک ہو گئے۔

اب وشوابھارتی کے مقاصد حسب ذیل ہیں:-

(۱) شانتی نکیتان میں۔ آشرم کی تعلیمی نو آبادی کے درمیان اُن مختلف تمدنوں پر غور کریں جو خالصتاً ہندوستانی ہیں یا وہاں محفوظ اور ترقی پذیر ہیں۔

(۲) شانتی نکیتان کی بنیاد اور سری نکیتان میں شعبۂ دیہات سدھار کے شعبے کے قیام سے گاؤں والے کے لئے پُرمسرت اور قانع زندگی کی داغ بیل ڈالنا۔

(۳) وشوابھارتی کے ذریعے مجموعی طور پر مشرق و مغرب میں لافانی تعلقات پیدا کرنا اور بین تہذیبی اور بین نسلی ارتباط اور ہم آہنگی کو ترقی دینا اور عہد حاضر کے مہتم بالشان مشن یعنی عالمی اخوت کی تکمیل کرنا۔

جس کو شاعر نے "دنیا کو ہندوستان کی دعوت" کہا تھا۔ یہہ انسان کی بلند ترین سچائی کے لئے ایثار کا پیغام ہے اور وہ شانتی نکیتان کی خلوت گاہ میں طوفانی حالات اور جدید دنیا کی عالمگیر بےچینی کے باوجود ان مقاصد کے حصول کے لئے پورے جوش اور انہماک سے جاری ہے۔

آج شانتی نکیتان کی تعلیمی نو آبادی کی دور دور دھوم ہے اور اس کے مقاصد نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی جڑ پکڑ رہے ہیں۔ وشوابھارتی دنیا کے مختلف حصوں کے سیاحوں کی زیارت گاہ ہے جن میں اکثر تحقیق و تجسس اور مطالعے کے لئے آتے ہیں اور شانتی نکیتان کے علماء کیلئے تحریکات لے آتے ہیں اس طرح بین قومی کام کے لئے ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا ہے جو اشتراکی زندگی کے لئے نشان راہ ہے۔

وشوابھارتی کا کتب خانہ ایشیا بھر میں اپنی قسم کا بہترین کتب خانہ ہے۔ جسکو ڈاکٹر ٹیگور کی عطیہ کتابوں سے قطع نظر بیرونی حکومتوں، اداروں اور مخیر اصحاب کی عطیہ کتابیں چار چاند لگاتی ہیں۔

دو مشہور شعبے اسلامی شعبۂ تحقیق اور چین بھون ہیں

آخر الذکر چین کی بیش قیمت کتابوں کا خزانہ اور قابل عملے کے ساتھ ایک سر برآوردہ چینی پروفیسر کے تحت کارگذار ہے۔ اور حال ہی میں ہندی بھون بھی قائم ہوا ہے۔ جہاں ہندی زبان اور ادب کی تعلیم میں جدید ہندوستان کی ضرورت کو بطور خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے یہ تمام شانتی نکیتان کی اپجی قابلیت کی تخلیق کے بین مظہر ہیں لیکن شعبۂ فنون لطیفہ بشمول شعبہ جات حسن کاری موسیقی اور رقص وشوابھارتی اسکیم میں کچھ کم اہم نہیں ہے ہندوستان کے کلاسکل رقص کی تجدید اور اس کو ازسرِ نو زندہ کرنے کا سہرا ٹیگور کے سر ہے جس سے خود اظہاری کا ایک نیا طریقہ ہاتھ آیا ہے۔ موسیقی کے لئے شاعر نے جو کچھ کیا ہے وہ سب جانتے ہیں۔ موسمی تقریبات اور کھیل جو آشرم کی زندگی کی نمایاں خصوصیت ہیں موسیقی اور خصوصاً روایاتی موسیقی کی تخلیق میں ہمت افزا ثابت ہوئے ہیں۔ مغرب اور ہندوستان کے صوبوں کے ماہرین موسیقی کی خاص تعلیم کیلئے شانتی نکیتان آئے ہیں۔ کلاسکی گانوں کی تعلیم کا وشوابھارتی میں خاص انتظام ہے اور آلاتی موسیقی کے سکھانے کے لئے عملہ بھی مقرر ہے۔

ٹیگور کے خاندان میں ہندوستان کے حسن کارانہ نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہوئی اور اب وشوابھارتی، رنگ کاری بت تراشی اور نقش کشی کا بہترین مرکز ہے۔ ہندوستان کے اکثر صوبائی آرٹ اسکولوں اور عجائب خانوں کیلئے وشوابھارتی نے ہی اساتذہ فراہم کئے۔ سری نکیتان میں شعبۂ دستکاری جاری ہے جہاں تجارتی اصول پر چمڑے اور وارنش کے کاموں کے شعبے قائم ہیں۔ اطراف واکناف کے دیہات کی دستکاری وشوابھارتی کے اس شعبے کی جدّت طرازیوں کے باعث بھونڈی اور بیجان یکسانیت سے بچ گئی ہے۔ اس کی سرپرستی میں متعدد دیسی دستکاریاں اور دیہی صنعتیں ازسرِ نو پیدا ہو رہی ہیں اور بیروزگاری کم ہو گئی ہے۔

دیہات سدھار اسکول کے شعبے میں کھیت اور میدان میں مل جل کر عملی کام کیا جاتا ہے اور مختلف طریقوں سے تجربات کئے جاتے ہیں مکمل زندگی کی نسبت ٹیگور کا فلسفہ امن پسندی کو پیشہ وارانہ تربیت اور ذہنی نشو و نما اور ایک ایسے تمدن کے ساتھ ہضم کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو کسی قیاسی تنگ نظری کا شکار نہیں۔ بلکہ انسان کے وسیع تجربات کا نچوڑ ہے۔

س۔ م

رابندر ناتھ ٹیگور

[ماڈرن ریویو کے ایڈیٹر مسٹر راما نند چیٹر جی کے مضمون کا ملخص ترجمہ]

زبان کے وسیع خزانے میں ایک لفظ بھی ایسا موزوں نہیں ہے جو رابندر ناتھ ٹیگور کے "جہاں نما دل" اور قوس قزح کی طرح کثرت میں وحدت کی جلوہ آرائیوں کو بے نقاب کرنے والی شخصیت کو کما حقہٗ ظاہر کرسکے۔ اُس کی موت پر اس کے بے شمار ہم وطنوں کے ساتھ ساری دنیا نے بلا لحاظِ مذہب وملت، رنگ و نسل اُس کی اُن مخلصانہ خدمات کو سراہا جو اس نے بحیثیت شاعر، مصور، فلسفی، پرستار انسانیت و کائنات اور ایک روشن ضمیر دانائے روزگار انجام دی ہیں۔ گویا نفاق و مخالفت کے سارے راگ اُس عدیم المثال روحانی ارتباط پیدا کرنے والے کے روحانی وجود کے یقین سے خاموش ہو گئے۔

اپنی زندگی میں ٹیگور سے زیادہ ہر دل عزیز نہ صرف اس کے اپنے وطن میں بلکہ دنیا بھر میں کوئی تھا اور نہ اب ہے۔ ساری دنیا کے لوگ اُس سے محبت کرتے تھے اور اُن کی محبت والہانہ شیفتگی اور پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی کیونکہ اُس کا باطنی حُسن اس کی شخصیت کے حُسن کے امتزاج سے نکھر گیا تھا۔ وہ ہمارے دلوں کا بادشاہ تھا اور اب بھی ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے مئی ۱۹۴۱ء میں اپنی زندگی کے اسّی سال پورے کیے اور ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ اسّی سال کی عمر نہ تو عام ہے اور نہ شاذ لیکن یہاں اس کی بڑی عمر سے زیادہ اس کی زندگی کی معنوی عظمت قابلِ لحاظ ہے۔ اس کی زندگی خیال و عمل کے حسن کارانہ سنجوگ کی زندگی تھی۔ اس کو اپنے وطن اور ہم وطنوں کے علاوہ دوسرے ملکوں اور وہاں کے رہنے والوں سے بھی یکساں محبت تھی۔ ایسے وسیع المشرب آدمی کی موت ہر دور میں ایک زبردست نقصان سمجھی جاتی ہے لیکن تاریخ عالم کے موجودہ نازک ترین اور بحرانی دور میں اس کی موت انسانیت کا ایک ناقابل تلافی اور بے پایاں نقصان ہے۔

اُس نے "میرے بچپن کے دن" کے عنوان سے اپنے بچپن اور گھر کے حالات کا ایک دل پذیر خاکہ پیش کیا ہے۔ نیز اس کے ایک مضمون "سوانح" سے اس کی زندگی کے حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے لیکن یہ سب کچھ ابتدائی (۲۷) سال کی سرگزشت ہے جس سے اس کی شخصیت کے (۵۴) سالہ ارتقا کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی اور اس وقت بہت ہی کم افراد ایسے ہونگے جو اس مابقی طویل مدت میں اس کے ذہنی ارتقا کے اہم واقعات بہم پہنچا سکیں۔

وہ ایک عظیم المرتبت شاعر اور نثر نگار ہے۔ بنگالی ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جو اس کے انتخاب قلم کا منت پذیر نہ ہوا ہو یا اُس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں، شاعرانہ وجدان الہامی خیالات اور روحانیت کی تابناکیوں سے اس کو سدرۃ المنتہیٰ پر نہ پہنچایا ہو۔ اس نے اوائل عمر ہی سے لکھنا شروع کیا جس کی صحیح تاریخ بتانا غیر ممکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے (۹) سال کی عمر میں میکبتھ کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا اگر یہ صحیح ہے تو اس کی تصنیف و تالیف کی عمر اکہتر سال ہوتی ہے۔ اپنی اوائل عمر کی تصنیفات و تالیفات کو جو نہ صرف کئی جلدوں کا احاطہ کر سکتی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر معمولی شاعروں اور ادیبوں کے لیے وجہ امتیاز بھی ہو سکتی ہیں، وہ طاق نسیاں کی نذر کردینا چاہتا تھا لیکن وشوا بھارتی کی مجلس اشاعت کے اصرار پر اُس نے اُن کو علٰحدہ چھاپنے کی اجازت دے دی۔ صرف بنگلہ زبان میں اس کی تصانیف کے حجم کا اندازہ رائل سائز کی ½ تقطیع کے ستراہزار صفحات کیا گیا ہے۔ اس میں مزید اضافہ ممکن ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کے آخری ہفتہ تک برابر نظمیں لکھتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے انگریزی میں بھی کئی ایک کتابیں لکھی ہیں اور اپنی بعض بنگالی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

اُس نے کوئی رزمیہ نظم نہیں لکھی۔ لیکن اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس دور میں لوگ بڑی بڑی کتابیں لکھنے اور پڑھنے میں مصروف ہیں بلکہ رزمیہ نظموں کا دور ختم ہو چکا ہے کیونکہ رزمیہ نظمیں خاندانوں کے باہمی جنگ و جدال اور مہم پسند اولوالعزمیوں اور احساس برتری کی پیداوار ہیں جو اس دور میں مفقود ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ جنگ فی زمانہ پہلے سے زیادہ مہیب، اندوہ ناک اور تباہ کن ہے اور ہمہ گیر ریاستوں کے آمر بڑے جنگجو اور حوصلہ مند ہیں مگر ان خونریز معرکہ آرائیوں میں شاعروں کے لیے اب جاذبیت اور اکسانے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ٹیگور نے اپنی بنگالی نظموں کے مجموعہ میں ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان "شہانتی پران" انگریزی میں اس کا ترجمہ "کم پن زے شن" ہوا ہے اور ہماری زبان میں "مکافات" کہہ سکتے ہیں۔ اس نظم میں اس نے رزمیہ نظم کا اس طرح خاکہ اُڑایا ہے۔

"مری پیاری! ایک زمانے میں ترے شاعر نے اپنے دل میں رزمیہ نظم کا
خاکہ ڈالا تھا۔
افسوس میں محتاط نہ تھا اور وہ تیرے چھن چھناتے پائل سے ٹکرایا اور
پاش، پاش ہوگیا۔
اور عامیانہ گیتوں میں بٹ کر ترے قدموں پر گر پڑا قدیم جنگی کہانیوں کا
سارا پلندہ قہقہہ کی موجوں بہا، آنسوؤں میں بھیگا اور ڈوب گیا۔
مری پیاری! مجھ کو اس کے نقصان کی تلافی کرنی چاہیے۔
اگر مرنے کے بعد دائمی شہرت کا مرا مطالبہ کالعدم ہوگیا ہے تو مری زندگی
ہی میں مجھے زندۂ جاوید بنادے۔
اور میں اپنے نقصان پر روؤنگا اور نہ تجھے ملعون ٹھیراؤنگا۔"
مگر انہی عامیانہ گیتوں نے ٹیگور کو زندہ جاوید بنادیا ہے۔

ٹیگور نے عنفوانِ شباب سے علم اور ادب کے مختلف شعبوں میں جو عظیم فتوحات حاصل کی ہیں وہ اتنی مختلف النوع ہیں کہ ان کا احاطہ کرنے کے لیے ایک طویل فہرست درکار ہوگی۔
ٹیگور کے ہفتاد سالہ جشن سالگرہ کے صدارتی خطبہ کی تمہید میں مہا مہوپادھیا ہر پرشاد شاستری ام۔ اے ڈی لٹ، سی۔ آئی۔ ای نے کہا تھا:-

"اس نے ادب کے تمام پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ بیتیں، قطعہ بند، چھوٹی نظمیں، طویل قطعات، مختصر افسانے، طویل افسانے، چھوٹی کہانیاں، ناول، نثری رومان، ڈرامے، مذاحیہ تمثیلیں، طربیہ، حزنیہ گیت، غنائی تمثیلیں، کرتان، پالاس اور غنائی نظمیں وغیرہ اور ان تمام شعبوں میں اس کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے مضامین بصیرت افروز، اس کے طعن تلخ اور طنز چبھتے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ شعرائے متقدمین کی بڑائی کا اعتراف کرتا ہے۔ قواعد اور لغات میں اس کا تفکر اور ادراک ہم میں سے اکثروں سے زیادہ گہرا ہے۔"

اس نے قدیم وجدید شعرا سے شاید زیادہ غنائی نظمیں لکھی ہیں۔ ٹینی سن نے اپنی نظم "وکٹر ہیوگو سے خطاب" میں اس جلیل القدر مصنف کو "فاتح تمثیل، فاتح رومان" خیالی امید وبیم کے بادلوں کا دیوتا"، "بالک شیدا"، "خدائے غم" "پُر اسرار اور مافوق الفطرت فطنت" کا مالک کہا ہے جس کی خامہ فرسائیوں کی بہار فلک کج رفتار کی خزاں سامانیوں کے باوجود اب تک دیدنی ہے۔" یہ سب اور

ان سے کہیں زیادہ القاب ٹیگور پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ پنڈت ہر پرشاد شاستری نے ٹیگور کی ادبی فتوحات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی وضاحت کے لیے میں صرف اس قدر اضافہ کروں گا کہ اس نے مذہب، تعلیم، سماج، سیاسیات، تاریخ، معاشیات اور لسانیات کے علاوہ فنِ موسیقی میں بھی اپنی خداداد قابلیت اور دستگاہ کے جوہر دکھلائے ہیں۔ وہ بنگلہ عروض کا امام تھا اور بنگلہ زبان کا شاید سب سے بڑا نقاد بھی۔ خطوط نگاری میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا اس کے خط بلحاظ تنوع اور لطافت انشا پردازی کے شاہکار ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے پوسٹ کارڈ بھی ادبی شہ پارے ہیں اور نثری نظمیں اور بے قافیہ اشعار لکھنے میں بھی وہ یگانہ تھا۔ اس نے بنگالی میں "دیباچہ عالم" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جس کے اب تک چھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ بنگالی میں چیستان نگاری کا شاید وہ پیشرو ہے۔ "پانچ عناصر کی سرگزشت" اس کی ایک انوکھی تصنیف ہے۔ یہ ایک خیالی مباحثہ ہے جو اس کے اپنے خیالات کا عکس ہے۔ اس نے چند ایک ناچ کھیل بھی اختراع کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگلہ زبان اور ادب کے لیے جو کچھ اس نے لکھا ہے مجموعی طور پر دوسرے ادیبوں کی قلمی کاوشوں سے کہیں زیادہ ہونے کے سوا ان کا مرتبہ بھی نہایت بلند ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد کے دس سال میں دو مرتبہ شدید بیماریوں کا شکار رہنے کے باوجود اس نے تین درجن کتابیں پیش کیں جو ابتدائی معلومات کی کتابوں، بچوں کے لیے اصلاحی نظموں، محض نظموں، بچوں کے لیے تصویروں کی کتابوں اور کئی ایک ناچ ڈراموں پر مشتمل ہیں۔ اس کی علالت کے آخری دنوں میں نظموں کے دو مجموعے اور ایک کتاب "بچپن کی سرگزشت" شایع ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ اور دو کتابوں کے چھپنے کی توقع تھی اور اسی زمانے میں بہت سے نئے گیت، مضامین اور مقالے بھی لکھے گئے ہیں جو اب تک شایع نہیں ہوئے۔ یہ سب کچھ اس کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک متبحر عالم تھا۔ اس نے بنگلہ زبان، سنسکرت، پالی اور انگریزی ادبیات سے براہِ راست استفادہ کرنے کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ادبیات کے انگریزی ترجموں کا بھی خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے کتاب خانے میں ہر موضوع پر کتابیں تھیں مثلاً

"کاشتکاری، لسانیات، تاریخ، طب، فلکیات، ارضیات، کیمیا، حشریات، امدادِ باہمی کے اصول، ریشم کے کیڑوں کی پرورش، اندرونی آرائش، نقاشی، چرم سازی، کھاد، نیشکر، تیل اور برتن سازی، کپڑا بننے کی مشینوں، پنسل وغیرہ پر لگانے کا سنہری روغن، سڑکوں پر چلنے والے انجن، دیہی معاشیات، پکوان، بدرو، خطاطی، سڑک سازی، انکیوبیٹر یعنی مصنوعی حرارت سے

پرندوں کے بچّے نکالنے کے جراثیم پیدا کرنے اور انسان کے قبل از وقت پیدا ہونے والے بچّوں کی پرورش کی مشین، وغیرہ فنون کے متعلق عمدہ لٹریچر۔

وہ ان کتابوں کا مطالعہ بیکاری کی خلیج کو پاٹنے یا وقت کاٹنے کے لیے نہیں کرتا تھا بلکہ وہ ان معلومات سے خاطر خواہ عملی استفادہ بھی کرتا تھا۔ وہ جذبات کے سیلاب پر بہنے والوں میں نہیں تھا بلکہ اس نے ایک سائنٹیفک دل پایا تھا۔ سر جگدیش چندر بوس سے اس کی دوستی رسمی بلکہ روحانی تھی۔ ملٹن نے اپنے دور میں جب کہ علم کی سوتیں اس قدر ہمہ گیر اور وسعت پذیر نہیں تھیں، کہا تھا کہ "شاعر کو تمام علوم میں مہارت تامہ ہونی چاہیے" ٹیگور اور ملٹن کا نصب العین اس باب میں یکساں ہے اگر ٹیگور ایک عظیم المرتبت شاعر اور نثار کی حیثیت سے چار دانگ عالم میں روشناس نہ بھی ہوتا تو اپنے وسیع مطالعے کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہوتا۔

بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ ٹیگور کے نوبل انعام پانے سے پہلے بنگال نے اس کی طبّاعی اور اختراعی صلاحیتوں کا احساس نہیں کیا۔ حالانکہ ٹیگور کی پچاس ویں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر کلکتہ ٹاون ہال میں جملہ مکاتیب خیال کے نمایندوں نے اس اہتمام سے اس کی خدمات کا اعتراف کیا کہ اس سے پہلے اور بعد آج تک کسی دوسرے مصنّف کو یہ عزّت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ اُس کے اعزاز میں کئی ایک تقریبیں ہوئیں کیونکہ بنگال کے بلند پایہ نقاد ٹیگور کو بڑی وقعت دیتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت کی باتیں ہیں جب کہ نوبل انعام سے اس کو نوازا نہیں گیا تھا البتہ اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ نوبل انعام ملنے کے بعد اس کی شہرت بنگال کے جغرافی حدود توڑ کر دنیا کے چاروں کھونٹ پھیل گئی۔

اس کی بعض کتابوں کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ ہندوستان کے کسی نئے مصنف کو تو کیا دنیا کے کسی ادیب کے ادبی کارناموں کو یہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی بنگلہ زبان کی بعض ایسی کتابیں جن میں ٹیگور کے سحر آفریں قلم نے لطیف مزاح اور ظرافت کے سدا بہار پھول کھلائے ہیں مغرب و مشرق کی کسی زبان میں بھی منتقل نہیں کی گئیں ان کتابوں کے ترجمے میں جن کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، معنوی لطافت، بنگالی الفاظ کا لوچ، ترنم، اسلوب بیان کا بانکپن اور محاوروں کی جادوگری عشر عشیر بھی نہ ملینگی جو اصل تصانیف کی جان ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ خود شاعر نے جن نظموں اور ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے بڑی حد تک ان میں اصل کا معنوی حسن، سادگی، زور، ترنم اور اسلوب بیان کی سحر آفرینی انگڑائیاں لیتی دکھائی دیتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ

اُس کی طباعیٔ ذہنی ادبی صلاحیتوں اور حسن کارانہ تخلیق کاریوں کا بہتر اندازہ کرنے کے لیے اس کی بنگالی تصانیف اور اُن کے ترجموں کے علاوہ اُن کتابوں کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کرنا ضروری ہے جو اس نے انگریزی میں لکھی ہیں مثلاً "شخصیت" "سادھنا" "آدمی کا مذہب" وغیرہ۔ لیکن ٹیگور کی استعداد اور ادبی فتوحات کے آنکنے کے لیے اصل بنگالی تصانیف کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اس کی بعض کتابوں کے جرمن ترجمے اس کثرت سے فروخت ہوئے ہیں کہ اگر مارک کی شرح تبادلہ گذشتہ جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد غیر معمولی طور پر نہ گرتی تو لاکھوں روپیہ اس کو بطور معاوضہ ملتا۔ اور وشوا بھارتی کے لیے سرمایہ کی فکر سے وہ ہمیشہ کو چھٹکارا پاتا۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اس کی بنگالی تصانیف کے زیادہ سے زیادہ چھٹے حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے اور بعض شہ کاروں کا ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا۔

اس کے بھجن، مذہبی خطبات اور روحانیت سے متعلق اس کے مضامین غیر شعوری طور پر بارگاہِ رب العزت میں اُس کی رسائی بلکہ یہ کہیے قدرت کے راز و نیاز کی پردہ دری کرتے ہیں اُس کے مذہبی گیتوں اور روحانیت میں ڈوبی ہوئی دوسری تحریروں نے سیکڑوں مصیبت کے ماروں کے زخم خوردہ دلوں پر مرہم کا کام کیا ہے۔

ضمیر اور تخئیل اس کے طلسمی عصا ہیں جن کے زور پر وہ جدھر چاہتا ہے گھومتا پھرتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ ٹیگور کی بلند پایہ قلمی کاوشوں ہی کا فیضان ہے کہ دنیا کے ہمہ گیر خیالات اور روحانیت کی ہریں بنگلہ ادب میں پھوٹیں اور وہ مقامی رنگ کو تج کر دنیا کی ترقی یافتہ ادبیات سے آنکھ ملانے کے قابل ہوا۔

فلسفہ میں وہ کسی خاص مکتب خیال کا معمار نہیں ہے اُس کو ویدانتی کہا جاتا ہے اس کا تعلق اُس قدیم فلسفہ مذہب کے معلمین سے ہے جن کے نزدیک مذہب اور فلسفہ ایک دوسرے کے لاینفک جزو ہیں۔ اس کے فلسفیانہ تفکر اور بالغ نظری کے اعتراف کے طور پر ۱۹۲۵ء میں ہندوستانی فلسفہ کانگریس کی پہلی میقات کا خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے اُس کو چُنا گیا۔ اس کی نظموں اور اُس کے مضامین میں اس کے فلسفۂ زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔

ٹیگور ادیب ہی نہیں تھا اگرچہ ایک ادیب کی حیثیت سے اس کا پایہ اس درجہ بلند ہے کہ محض اس کی بنگلہ تصانیف کے مطالعہ کے لیے اجنبی بنگلہ زبان سیکھینگے، وہ ایک جامع کمالات شخصیت رکھتا تھا جس نے اور چیزیں سیکھی تھیں ہندوستانی کلاسکی موسیقی کی تعلیم پائی تھی گو وہ موسیقی کا استاد یا ماہر اصطلاحی معنوں میں

نہیں تھا لیکن فن موسیقی پر اس کی لکھی ہوئی کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں موسیقی سے اس کو عشق تھا موسیقی کی سحر آفرینیاں اُس کو دنیا وما فیہا سے بے خبر کردیتی تھیں۔ اس فن میں اُس نے وہ کمال حاصل کیا تھا کہ "ماہرین فن" اس کی مہارت کے معترف تھے۔ یہ رائے محض اس کے بھجن، وطنی ترانے اور دوسرے گیتوں اور اُن کے نئے نئے سانچوں یا اُس کے وجد آفریں ترنم کی بنا پر قایم نہیں کی گئی بلکہ فن موسیقی پر اُس کے بلند پایہ خیالات سے ماخوذ ہے۔ اُس نے اپنے گیتوں کو مترنم سانچوں میں ڈھالنے کے لیے ایسے الفاظ تراشے جو ایک خاص معنوی گھیر کے ساتھ بہت دل پذیر ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مغربی ماہرین موسیقی میں فرانز پیٹر شوبرٹ نے گیت لکھنے میں ریکارڈ قایم کیا ہے، انسائیکلو پیڈیا کی گیارہویں جلد میں شوبرٹ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے "وہ دنیا کا سب سے بڑا گیت لکھنے والا ہے۔ اس نے ناٹک گانے اور غنائی قطعات کے سوا چھ سو گیت لکھے ہیں" لیکن ایک سرسری اندازے کے بموجب ٹیگور کے لکھے ہوئے گیتوں کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے۔ اور یہ وہ گیت ہیں جو اُس نے موسیقی کے سانچوں میں ڈھالے ہیں۔ ناچ کھیل اور غنائی تمثیلیں ان کے علاوہ ہیں۔ اس تعداد میں اضافہ ممکن ہے کیونکہ آخر وقت تک اس کا اشہب قلم سرگرم عمل رہا ہے۔

ٹیگور فن اداکاری کا ماہر ہونے کے ساتھ ایک زبردست اداآموز بھی تھا اس نے اپنے ڈراموں میں خود پارٹ ادا کیے اور دکھا دیا کہ اداکاری کا فن فطری اور بلند پایہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس فن میں اس کی مہارت کا سبب یہ ہوا کہ اوایل شباب سے وہ اپنی نظمیں، مباحثے، افسانے، ڈرامے اور ناول منتخب حلقوں میں سنایا کرتا تھا جس سے اس کی خطیبانہ اور اداکارانہ صلاحتیں چمک اُٹھیں۔

اگر یہ سچ ہے کہ موسیقی کے عام مظاہروں میں معزز خواتین کے حصہ لینے کی تجدید کا سہرا برہمو سماج کے سر ہے تو اس میں ٹیگور اور اس کے خاندان کا بڑا حصہ ہے انہوں نے معزز گھرانے کی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے عام مظاہروں میں اداکاری کو ممکن بنا دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے معزز خواتین اور لڑکیوں کے لیے ایسے رقص کو بھی رواج دیا جن سے جنسی جذبات کو تحریک نہیں ہوتی بلکہ وہ بے گناہ تفنن اور دلچسپ تفریحی کھیل بن گئے ہیں۔ ٹیگور نے شانتی نکیتان کی لڑکیوں کو یہ رقص بذاتِ خود سکھائے ہیں۔

ٹیگور کے وطنی ترانوں اور گیتوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں طوفانی جوش و خروش، دکھاوے کی بہادری، دبنگاپن، دھمکیاں اور گیدڑ بھبکیاں نہیں پائی جاتیں بلکہ شائستگی کے ساتھ ایک خاص متانت پائی جاتی ہے۔ اس کے ترانے رباب دل کے تاروں کو چھیڑ کر دل پذیر نغمے پیدا

کرتے ہیں، مادر وطن کو ہماری آرزوؤں کے مندر کی "دیوی" بناتے ہیں، افسردہ اور مضمحل جذبات میں مصیبتوں کو اٹھانے کی جرات، ولولہ اور امید کی بجلیاں دوڑا کر زہر آب زندگی کو گوارا بنا دیتے ہیں اس کے کلام میں آپ کو کہیں بھی فرقہ آرائی، جنگ و جدل یا ماضی کے ناخوشگوار تاریخی جھگڑے بکھیڑوں کی موہوم سی جھلکیاں بھی نظر نہ آئینگی۔ اس نے تیس سال پہلے بنگال کی سودیشی تحریک کے ولولہ آفریں زمانے میں چند ایک پر جوش نظمیں لکھی ہیں جن کے پڑھنے سے دل دھڑکنے لگتا ہے اور مردہ رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے پھرنے لگتا ہے۔

اسکاچستان کا مشہور وطن پرست اینڈریوز فلیچر آف سالٹن کہتا ہے کہ "اگر کسی کو ہر قسم کی جذباتی نظمیں لکھنے کی آزادی دے دی جائے تو اس کو اس بات کی پروا نہ کرنی چاہیے کہ قوم کے لیے قانون کون مدون کرے" یاد رکھیے قوموں کی تعمیر میں گیتوں اور ترانوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ٹیگور کے گیتوں اور ترانوں کا بنگال کی تعمیر و تشکیل میں بڑا حصہ ہے اور آئندہ بھی وہ بنگالیوں کی، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ، شہری ہوں یا دیہاتی، تہذیب و تمدن کی تعمیر اور کردار سازی میں شریک غالب رہینگے۔

ٹیگور نے سودیشی تحریک میں ایک شاعر کی حیثیت ہی سے حصہ نہیں لیا بلکہ اس کے معاشری سیاسی خطبات اور سالانہ نمایش اور میلے بھی جو اُس کے زیر اہتمام منعقد ہوتے تھے اسی قومی خدمات کا جزو ہیں۔ اس نے کپڑا بننے کے سوا ملک کی دوسری صنعتوں میں خاص طور پر دیہی دست کاریوں کو از سر نو رواج دینے کی پر خلوص کوشش کی اس نے ہندوستان میں تعلیم کو حقیقی معنیٰ میں ہندستانی بنانے کے ساتھ وسیع معنوں میں عالمگیر بنایا اور دیہات میں حفظان صحت و ترقیات عامہ کے رفاہی کام میں امکانی حصہ لیا۔ اپنے اسٹیٹ میں اس نے بڑے نمایاں کام انجام دیلے ہیں جن کی بنا پر سرکاری رپورٹوں میں اُس کی بڑی تعریف کی گئی۔

وہ اپنے آسامیوں کے سود و بہبود کے لیے دل سے کوشاں رہتا تھا اور اس کے آسامی بھی نہ صرف اس کی عزت کرتے بلکہ اُس پر جان دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک کام کے سلسلہ میں ضلع کے انگریز مجسٹریٹ کے ہمراہ جس میں اس کا اسٹیٹ واقع تھا، اس کو جانا پڑا۔ اگرچہ اُس زمانے میں انگریز مجسٹریٹ کا بڑا رعب داب تھا لیکن رعایا نے ٹیگور اور مجسٹریٹ کے لیے صرف ایک پالکی کا انتظام کیا۔ جب ٹیگور سے باز پرس ہوئی تو اُس نے کہا کہ میرے نزدیک یہ بالکل فطری اور موزوں ہے کہ جو کوئی میرے ہمراہ چلنا چاہے، خواہ وہ انگریز اور ضلع کا مجسٹریٹ ہی کیوں نہ ہو، پیدل چلے۔

بالآخر بڑی رد و قدح کے بعد رعایا نے مجسٹریٹ کے لیے ایک مریل ٹٹو فراہم کیا۔

عدم تعاون کے متعلق اس کی تعمیری اسکیم یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی تعمیری خود اعتمادی کا خاکہ اس کے اُن خیالات میں نمایاں ہے جو اُس نے تیس سال پہلے تعلیم، دست کاری اور دیہات سدھار وغیرہ کے بارے میں اپنے مختلف مضامین اور خطبات میں ظاہر کیے ہیں۔ تفصیلات کے لیے سودیشی سماج پر اس کی ۲۲ جولائی ۱۹۰۴ء کی تقریر اور بنگال صوبائی کانفرنس منعقدہ پبنہ ۱۹۰۸ء کا صدارتی خطبہ ملاحظہ فرمائیے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کی بین قومیت کا آغاز اُن تلخ اور یاس آفریں تجربات سے ہوا جن سے مخالفت تقسیم بنگال اور سودیشی تحریکات کے زمانے میں اس کو دوچار ہونا پڑا ایسے تجربات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن انسانی برادری سے اس کی محبت اور بین قومی معاملات سے اس کی دلچسپی کے نقوش اس کے لڑکپن کی تحریروں میں بھی پائے جاتے ہیں جو عمر کے ساتھ ساتھ اس کے کردار کے جزو لاینفک بن گئے۔ اس نے چالیس سال پہلے انہی خیالات کو اپنی ایک نظم "پرباسی" میں پیش کیا ہے جو اسی نام کے ماہنامے کی پہلی اشاعت میں شایع ہوئی تھی۔ اس نظم کی تمہید میں وہ اعلان کرتا ہے کہ ہر جگہ اس کا وطن ہے ہر ملک اس کا ملک ہے اور ہر گھر میں اس کے اپنے رشتہ دار ہیں اور یہ کہ اس کی مذہب پرستی اور وطن دوستی، تنگ نظری، نفرت اور حقارت کا شکار نہیں ہے اس کا عقیدہ ہے کہ ہندستان کا ایک الٰہی پیغام، ایک مشن اور ایک خاص مقصد ہے، جو قدرت نے دنیا والوں تک پہنچانے کے لیے اس کے سپرد کیا ہے۔ وہ اس کا منکر نہ تھا کہ دوسرے ممالک کو ایسے پیغام اور تعلیمات ذات باری نے عطا نہیں کیے۔ وہ مغرب کو متکبرانہ انداز حقارت سے نہ دیکھتا تھا بلکہ اس کے برخلاف اس کے ذوقِ تجسس و تفحص، سائنس، راستی، آزادی اور انصاف کے لیے جان پر کھیلنا اس کی انسان دوستی، غریبوں کی دستگیری، عامۃ الناس کے سود و بہبود کے لیے جدوجہد کرنا ایسے نیک اوصاف ہیں جن کے باعث مغرب کی اس کی نظروں میں بڑی وقعت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ مشرق، مغرب کی کورانہ نقالی نہ کرے بلکہ جس طرح ایک صحت مند اور طاقتور آدمی مقوی اور مرغن غذا ہضم کرتا ہے، مغرب کے بہترین اوصاف کو اختیار کرکے اپنے تمدن اور کردار کا حصہ بنالے اور یہ محض پڑھنے یا ظاہری شکل وصورت کی نقل اُتارنے سے ممکن نہیں ہے کیونکہ مغربی افراد کی پوشاک مشرقی غلاموں کی سیرت نہیں سنوار سکتی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ مغرب، مشرق کے سینہ سے حرارت پا سکتا ہے، لیکن یہ حرارت وہ نہیں ہے جو مادہ پرستی، بربریت اور بہیمیت پیدا کرے۔ اس کی

تحریروں سے دل پر یہ نقوش مرتسم ہوتے ہیں کہ جب تک مشرق کے ہر مکتبِ خیال میں خودی، خود اعتمادی عزتِ نفس اور سیاسی بیداری نہ پیدا ہوگی مغرب اپنی غاصبانہ داروگیر سے ہرگز باز نہ آئیگا۔

اس کے ہاتھ مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے تھے کہ ساری انسانی برادری سے باہمی دوستی اور یکجہتی کے لیے مصافحہ کریں۔ وہ مختلف نسلوں اور برِّ اعظموں میں یکجہتی پیدا کرنے کا بڑا حامی تھا اس نے تقریباً ساری دنیا کا سفر کیا اور چین، سیام، جزائر شرق الہند، ایران، جاپان اور عراق سے ہندستان کے تمدنی تعلقات کی تجدید کی نیز یورپ اور امریکہ کا سفر کرکے ان ممالک کے بسنے والوں سے دوستانہ اور تمدّنی تعلقات قایم کیے۔

ہندستانیوں پر برطانوی قوم کے بے پناہ مظالم کے باوجود، جن کی اس نے کھلم کھلا مذمت کی ہے برطانوی عوام کے متعلق اس کی رائے کبھی تنگ نظری اور تعصب کا شکار نہیں رہی اور اس نے فراخ دلی سے اُن کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ یاد ہوگا کہ ٹیگور ہی پہلا آدمی تھا جس نے جلیان والے باغ کے قتلِ عام کی کھلم کھلا مذمت کی اور "سر" کا اعزاز احتجاجاً واپس کردیا۔ اس نے تحریک عدم تعاون کے مجہول پہلو کی حمایت نہیں کی اور طلبا کے مدرسوں اور کالجوں کو چھوڑ کر عملی سیاسیات میں حصّہ لینے کی پرزور مخالفت کی۔ اس کی سیاست کا تعلق قومی جدوجہد کے رسمی مظاہروں سے زیادہ جن میں عوام کا جم غفیر حصّہ لیتا ہے، کردار سازی اور سماج کی تہذیب سے رہا ہے وہ ایک انتہا پسند جوشیلے مدبّر کی طرح سیاسی آزادی کا حامی ہے لیکن اس کی آزادی کا تصور اکمل اور بنیادی ہے۔ اس کے نزدیک کاہلی، بزدلی، جہالت، خود غرضی، جلبِ منفعت، توہمات، بے جان رسومات، ملاؤں اور پنڈتوں کا اثر و اقتدار، رسم الخطی تعصب کی زنجیریں ہماری جکڑبندی میں اغیار کی غلامی کے جوئے سے کم نہیں ہیں۔ وہ خارجی موانعات کا قائل نہ تھا اور نہ اس سے آزادی کا نظریہ صورت پذیر ہوتا ہے اس لیے وہ ضمیر کی آزادی کو جو ذاتی ایثار، شعور، تہذیبِ نفس اور خود اعتمادی کی پیداوار ہو، نہایت ضروری سمجھتا ہے۔ اس زاویۂ نظر نے ہندستانی سیاست کے مسئلہ کے متعلق اس کے خیالات کی بڑی حدتک اصلاح کی ہے اور یہی غالباً اس سے نمٹنے کا بہترین طریقہ ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ روح کو آزاد کرے اور اس کو پَر لگاکر ہَوا کے دوش پر اُڑائے تاکہ اس میں تخئیل و عمل کی بےکراں وسعت پیدا ہو۔ خوف کو دُور کرنا اس کا اولین مقصد تھا اس لیے اس کی سیاسی اور روحانی خدمات ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ وہ بارگاہِ ایزدی میں اس طرح دعا کرتا ہے۔

"جہاں دل خوف سے آزاد اور سر اونچا ہو۔
جہاں علم عام ہو۔
جہاں دنیا تنگ گھریلو دیواروں سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوئی ہو۔
جہاں الفاظ سچائی کی گہرائی سے نکلتے ہوں۔
جہاں انتھک کوشش کامیابی کے لیے اپنا بازو پھیلاتی ہو۔
جہاں عقل کی شفاف ندی فرسودہ عادتوں کے ریگستان میں نہ بھٹکی ہو۔
جہاں "تو" دل کو دایم وسعت پذیر خیال اور عمل آزادی کی جنت میں رہبری کرتا ہو۔
معبود میرے ملک کو بھی بیدار ہونے دے۔"

اہل ہند کو یاد رکھنا چاہیے کہ آزادی کی اس جنت کے حاصل ہونے سے پہلے ٹیگور نے موت کا تلخ جام پی لیا ہے اور اب اس دعا کو حقیقت بنانا اُن کا فرض ہے۔

عمر اور جسمانی کمزوریوں کے باوجود ٹیگور رجعت پسند اور دشمنِ تحقیق نہ تھا بلکہ نئی روشنی کے لیے اس کی روح ہمیشہ بیدار رہتی تھی اس لیے وہ آخر وقت تک ایک ترقی پسند مصلح رہا اور اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی بڑھاپے کی نذر نہ ہوئیں یہی وجہ ہے کہ اس کی تازہ ترین نظموں میں تخئیل اور وجدان میں انحطاط یا زوال نہیں پایا جاتا وہ ایک سرگرم مصنف تھا اور اس میں نئے نئے ذہنی اور روحانی تخئیلات اور روح عصر کے قبول کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔

جب لارڈ کرزن نے بنگالیوں کے مسلسل احتجاج اور شور و غوغا کو نظر انداز کر کے بنگال کے ٹکڑے کر دیے تو تحریک مخالفت کو تقویت پہنچانے اور عوام میں خود اعتمادی اور آزادئ خیال پیدا کرنے کے لیے اپنی روح اور عمل کی ساری توانائیوں سے کام لے کر اس نے ہر ممکن کوشش کی لیکن جب عوام کی ناکامی اور مایوسی، دہشت کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تو ٹیگور نے صاف طور پر متنبہ کیا کہ ہندستانی قومیت کو دہشت اور بربریت سے پامال نہ کیا جائے۔ اگرچہ اس کو عملی سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم اس نے نازک ترین موقعوں پر اپنی قوم کو تنبیہیں اور روح پرور پیامات دیے ہیں وہ قوم کی غارت گرانہ سرگرمیوں کو جن سے فوجی یا معاشی تحریکات متاثر ہوتی ہوں سخت مذمت کرتا تھا اس کا ہمیشہ یہ ایقان رہا ہے کہ جو رقوموں کے باہمی عہد و پیمان سے جنگ کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ اپنی بہیمانہ غارت گری پر پشیمان نہ ہونگی اس کے نزدیک اس مرض کا واحد علاج یہ ہے کہ حرص و آز کا قاطبتاً قلع قمع کر دیا جائے اور ہمسایہ قوموں سے تعلقات کی نیو ایسی

دوستی اور محبت پر رکھی جائے جیسے دو سچے دوستوں میں پائی جاتی ہے۔

کانگریس کی اچھوت سدھار اور چھوت چھات دور کرنے کی تحریک سے بہت پہلے ٹیگور کے گھر میں اور عام طور پر شانتی نکیتن میں پکوان اور دوسری خدمتوں پر اچھوتوں ہی کو ملازم رکھا جاتا تھا۔

ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں دعا مانگی ہے کہ "اے معبود مجھے وہ طاقت دے کہ جس سے غریبوں اور کنگالوں کو میں کبھی حقیر و ذلیل نہ سمجھوں" اور بارگاہ خداوندی میں اس کی یہ پرخلوص دعا قبول ہوئی۔

عورتوں کے متعلق اس کے خیالات ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہونگے جو اس نے "چترا" کے آغاز میں ظاہر کیے ہیں۔

"میں چترا ہوں، کوئی دیوی پرستش کے قابل ہے اور نہ حقیر شے کو پروانے کی طرح لاپروائی سے جھاڑ دینا چاہیے۔ اگر تو مجھے ازراہِ نوازش کارزار حیات میں اپنا رفیق اور اپنی زندگی کے اہم فرائض میں مجھے اپنا شریک و سہیم بننے کی اجازت دے تو تجھ پر میری فطرت آئینہ ہوجائیگی۔"

لیکن عورت کی نسبت اُس کے خیالات معلوم کرنے کے لیے اس کے مضامین، نظموں اور افسانوں کو پڑھنا چاہیے۔ بحیثیت ایک ماہر تعلیم ہونے کے قدیم ہندستان کے مثالی اُستاد کی روح اس کی سادگی، رامش و رنگ سے اُس کا اجتناب، پاکیزگی اور پاکبازی پر زور دینا، اس کی روحانیت، ..... شاگرد کے تعلقات اور اس کی فطرت دوستی، اور روح و جسم کے اعمال کی تہذیب وغیرہ کو اس نے مثالی بین قومی اقامتی جامعہ وشوا بھارتی میں محفوظ کر دیا ہے۔ اپنی آخری علالت تک جب کبھی وہ شانتی نکیتن میں رہا اکثر مندر میں عبادت اور دعا میں شریک ہوتا اور بحث ومباحثہ میں سرگرمی سے حصّہ لیتا تھا۔ قدیم اسپرٹ کی بقا کے لیے اگرچہ شانتی نکیتن میں اتنا کچھ اہتمام کیا گیا تھا لیکن قدیم رسم و رواج کی اندھا دھند تقلید نہیں کی جاتی تھی۔ شاعر کا نصب العین عالمگیر ہے۔ وہ تمام علوم اور تہذیبوں کو اپنوں کے لیے اس طرح طلب کرتا تھا جیسے وہ انہی کا ورثہ ہیں۔ ہندستان کے دونوں صنف کے ہونہاروں کو ان کے عظیم الشان ماضی سے وابستہ کرنے کے ساتھ جہاں تک ادارے کی مالی حالت اجازت دیتی وہ ہندستان کے فرقوں کی تہذیبوں کو عملاً ترقی دے رہا تھا۔ نیز بیرونی تہذیبوں کے سربرآوردہ نمائندوں کو بھی مدعو کرتا تھا۔ وہاں "چینی بھون"، چین کے مطالعہ کے لیے قائم ہے، نیز اسلامی اور تبتی تہذیبوں کے علاوہ ہندو اور بدھ متی تہذیبوں، اور عہد وسطیٰ کے رشیوں کی تعلیمات سے بہرہ ور کرنا وشوا بھارتی کی نمایاں خصوصیت رہی ہے اس انتظام سے شانتی نکیتن میں مختلف مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کرنا ہر ایک کے لیے ممکن

ہوگیا ہے یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی درسگاہ کو فرقہ واریت، اور رنگ ونسل کے تعصب کی جولان گاہ بنانا نہیں چاہتا تھا۔

وشوا بھارتی، صرف ادبی یا پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے قایم نہیں ہے بلکہ وہاں ہر دو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ٹیگور چاہتا تھا کہ آدمی علم سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ، کام کرنے کا دلدادہ اور صنعت میں مہارت تامہ رکھے۔ وہ ذہنی تعلیم کے ساتھ فن کارانہ اور جمالیاتی تعلیم کو ضروری جانتا تھا۔ وشوا بھارتی میں اس وقت ایک تحتانیہ، ایک فوقانیہ، ایک کالج، ایک پینٹنگ اور ماڈلنگ اسکول، ایک گریجویٹ ریسرچ اسکول، ایک مدرسہ زراعت، دیہات سدھار کا ایک امداد باہمی بنک اور ایک ادارۂ حفظانِ صحت قایم ہے۔ یہاں ہر دو اصناف کے طلبا کے لیے کھیلوں اور جسمانی ورزشوں کا جداگانہ انتظام ہے، گاؤں کے متعلق ٹیگور کا خیال یہ ہے کہ دیہات کے تمام حسین اور صحت ور عناصر کے سنجوگ کے ساتھ اُس میں شہری زندگی کی سہولتیں جو زندگی اور اس کی قابلیتوں کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں فراہم کی جانی چاہییں۔ یہاں مخلوط تعلیم ہوتی ہے۔

ٹیگور نے وشوا بھارتی کے اخراجات کی تکمیل کے لیے ابتدائی چند سال میں اپنی بعض کتابوں کا حق تصنیف، بیچ دیا اور اپنی بیوی کے زیورات یا تو رہن کروائے یا اُن میں سے کچھ بیچ بھی دیے۔ بعد کو سرمایہ فراہم کرنے کے لیے اس نے جو کوششیں کی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ٹیگور نے درسگاہ کے ابتدائی زمانے میں سے ایک عرصے تک نہ صرف اہلکاری کے فرائض انجام دیے بلکہ مختلف مضامین کے درس بھی دیے۔ وہ بچوں کے ساتھ اُن کے کمروں میں رہتا تھا، راتوں کو انھیں کہانیاں اور نظمیں سناتا۔ اپنے بنائے ہوئے کھیلوں سے انھیں محظوظ کرتا اور تربیت حواس کے طریقے بھی بتایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی لڑکوں کے اصرار پر وہ اُن کے ساتھ مسابقتی دوڑ میں حصہ لیتا اور ہمیشہ اُن سے بازی لے جاتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی صحت بہترین تھی کیونکہ جوانی میں پیشہ ور پہلوانوں سے اس نے کشتی کا فن سیکھا تھا۔ ابتدائی زمانے میں اساتذہ اور طلبا کی تعداد نہایت محدود تھی اور ٹیگور کی بیوی جو پکوان کی بڑی ماہر تھیں طالب علموں اور استادوں کو بہترین کھانے خود پکا کر دیتی تھیں حال حال تک بھی وہ بعض جماعتوں میں پڑھاتا تھا اور ادارہ سے مختلف حیثیتوں سے اس کا تعلق تھا۔

جاپان سے وہ ایک جاپانی کشتی کے ماہرِ فن کو اپنے ساتھ اس لیے لایا کہ وہ لڑکے اور لڑکیوں کو اپنے بچاؤ کا فن سکھائے، نیز ان کے لیے "لٹ بازی" اور باغبانی سے واقفیت حاصل کرنے کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی گئی تھیں، شانتی نکیتن میں "فٹ بال"، اور دوسرے کھیلوں کے لیے بہترین

میدان ہیں۔ بنگال بھر میں شانتی نکتین کی ٹیم سب میں بہتر ہے۔

طلبا کی اپنی حکومت، غیر فرقہ وارانہ دعائیں اور عبادت اور موسمی تقاریب وشوا بھارتی کی ممتاز خصوصیتیں ہیں۔ ٹیگور نے امتحانات میں نگرانوں کو نہ رکھ کر محترم طریقہ یا آنر سسٹم کو رواج دیا ہے۔

ٹیگور اوائل عمر ہی سے ایک جرنلسٹ یا صحافی تھا۔ عرصہ دراز تک اس نے کئی ایک ماہناموں کی ادارت کی اور مرنے کے آخری ہفتہ تک کئی ایک رسالوں کی قلمی اعانت کرتا رہا۔ اس نے کئی ایک ہفتہ وار پرچوں کے لیے بھی مضامین لکھے۔ بنگال میں وہ ایک ہی آدمی تھا جو ایک رسالے کو شروع سے آخر تک متنوع اور بہترین مضامین نثر اور نظم سے پر کرسکتا تھا۔ اس کی خوش خط تحریر کو پڑھنے سے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے اس نے کئی ایک اہلِ قلم پیدا کیے جنھوں نے اس کے بتائے ہوئے موضوع پر کام کرکے نام پیدا کیا۔

اس کی خوبصورت بنگالی لکھت کی ہوبہو نقل اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کی تحریر کو بارہا دیکھنے والے بھی اصل و نقل میں تمیز نہیں کرسکتے۔

بیرونی دنیا میں عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ "گیتان جلی" کی نظموں سے پہلے ٹیگور نے اپنی کسی نظم کا خود انگریزی میں ترجمہ نہیں کیا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اس کی مترجمہ نظمیں ماڈرن ریویو بابتہ ۱۹۱۲ء کی فروری، اپریل اور ستمبر کی اشاعتوں میں چھپ چکی ہیں۔ انگریزی میں اس کے لکھنے کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۱۹۱۱ء میں ماڈرن ریویو کے ایڈیٹر نے اس کی بنگالی نظموں کو انگریزی میں منتقل کرنے کا اس کو مشورہ دیا۔ جس پر ٹیگور نے اپنی دو نظمیں جن کا انگریزی ترجمہ آنجہانی لوکندرناتھ پالٹ آئی سی ایس نے کیا تھا اور جو ماڈرن ریویو ۱۹۱۱ء کے مئی اور ستمبر نمبروں میں چھپا ہے بھیج کر ٹال دیا اور جب اس سے خود انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش کی گئی تو اس نے جواب میں لکھا "میں کس حیلہ سے اس کو واپس بلاؤں جس کو میں نے روتا چھوڑا ہے"۔ یہ مدرسہ کی تعلیم اور اس کی لازمی مشقوں کی طرف مزاحیہ اشارہ ہے لیکن انگریزی شاعری کی دیوی اور فطنت اس کو آسانی سے چھوڑنے والے نہ تھے اس کے کچھ عرصہ بعد ٹیگور نے انگریزی میں اپنی بنگالی نظموں کو منتقل کرنا شروع کیا۔

وہ انگریزی لکھنے میں ہمیشہ جھجکتا تھا۔ اگرچہ اوائل عمر میں پروفیسر ہنری مارلے جیسا انگریزی کا نقاد، اس کے انگریز ساتھیوں کے سامنے، ٹیگور کے اسلوبِ تحریر کی بڑی ستایش کرتا تھا۔ ٹیگور نے "انگریز اور ہندستان" کے عنوان پر ایک مقالہ لکھا جس میں اس نے سخت نکتہ چینیاں کی تھیں۔ ہنری مارلے نے تمام طلبا کو اُن کے نوٹ کرنے کا مشورہ دیا۔

ٹیگور محنت کا سخت عادی تھا۔ وہ بڑی رات گئے تک کام کرتا اور پھر گجردم اٹھکر عبادت کے بعد روزمرہ کے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ دن اور رات کے چند ایک گھنٹے اس کے آرام اور کھانے پینے کے لیے مخصوص تھے اور باقی اوقات کام کے لیے، دوپہر میں بھی وہ قیلولہ تک نہ کرتا تھا۔ حالانکہ شانتی نکیتن کی گرمی ناقابل برداشت ہے۔

علالت سے پہلے بڑھاپے کی کمزوریوں کے باعث اس کی عادتوں میں تبدیلی ناگزیر ہوگئی تھی لیکن وہ نوجوانوں سے زیادہ کام کرتا تھا۔ جب گاندھی جی شانتی نکیتن گئے تو انھوں نے بہ اصرار اس سے دوپہر میں آرام کرنے کا وعدہ لیا۔

یہ اس شاعرِ اعظم کی بے ریب و ریا زندگی کا سرسری خاکہ ہے جس نے اپنے لافانی کارناموں سے دنیا بھر میں ہندستان کو سربلند کیا اور اس کی شہرت و عظمت میں چار چاند لگائے۔

سید مہدی حسین
سابق طالب علم

ننھے کی دُنیا

کاش میں اپنے ننھے کی اپنی دُنیا کے درمیان ایک پُرسکون گوشہ پا سکتی! میں جانتی ہوں کہ اس دنیا میں ستارے بھی ہیں۔ جو ننھے سے بات چیت کرتے ہیں۔ اور آسمان بھی ہے۔ جو اس کے چہرے پر جھکا ہوا اپنے سادہ لوح بادلوں اور قوسِ قزح سے ننھے کا دل بہلا رہا ہے۔

وہ جو اپنے گونگے ہونے کا یقین دلاتے ہیں اور جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے، رینگتے ہوئے ننھے کی کھڑکی تک آتے ہیں۔ اس کو اپنی کہانیاں سُناتے ہیں۔ اور نہایت چمکیلے کھلونوں سے بھرے ہوئے تھال ننھے کے لیے لاتے ہیں۔ کاش میں اس رستے پر سفر کر سکتی جو ننھے کے دل میں سے ہو کر جاتا ہے۔ اور تمام سرحدیں گزر کر وہاں پہنچ جاتی:۔

جہاں ایلچی ایسے فرائض پر روانہ ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی مقصد نہیں۔ اور جو ایسے بادشاہوں کی سلطنتوں کے درمیان دوڑتے ہیں۔ جن کی کوئی تاریخ نہیں۔

جہاں عقل اپنے قوانین کے پتنگ بنا کر اُڑاتی ہے۔ اور جہاں صداقت "حقیقت" کو اُس کی زنجیروں سے آزاد کر دیتی ہے۔

ٹیگور۔

شاعرِ اعظم ٹیگور

بین الاقوامی شہرت کے مالک شاعرِ اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جس پر خدا نے فراخ دلی سے رحم و کرم کی بارش کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی خاندان بیک وقت علم کے ساتھ ساتھ دنیوی دولت کا مالک نہیں ہوتا۔ یہ دو کیفیتیں بالکل متضاد ہیں۔ جہاں ان میں کی ایک کا گزر ہوا وہاں دوسری پھٹک کر بھی نہیں دیکھتی۔ ٹیگور کا خاندان اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے جہاں وہ بڑی بڑی زمینات کا مالک ہے، علم و ادب کا گہوارہ بھی ہے۔ رابندر ناتھ کے دادا دوار کا ناتھ اپنے شاہانہ مزاج اور اعلیٰ کردار کے سبب "شہزادہ دوارکا ناتھ" پکارے جاتے تھے۔ رابندر ناتھ کے والد دیوندر ناتھ علوم و فنون کی سرپرستی، صوفیانہ زندگی اور شریفانہ اخلاق کی وجہ "مہارشی" کہلاتے تھے۔ یہ مثنوی مولانا روم اور دیوانِ حافظ کے شیدا تھے اسی طرح رابندر ناتھ کا خاندان اچھے افراد پر مشتمل تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ہندوستان کی ملکی زبان اور بنگالی ادب کی اس وقت حفاظت کی جبکہ ۱۸۳۵ء میں انگریزی کی ترویج کی طرف ایسا ظالمانہ اقدام کیا گیا کہ جس سے دوسری زبانیں بُری طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں۔

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو بچہ ایسی فضا میں پرورش پائے جو شعریت سے معمور ہے کس ڈھنگ کا ہوگا؟ رابندر ناتھ کے اطراف ادب ہی ادب تھا۔ اِسی ماحول میں رابندر ناتھ پل کر جوان ہوئے اور دنیائے ادب میں نام پیدا کیا۔

پیدائش | ۷ مئی ۱۸۶۱ء حقیقت میں روشن دن تھا جب کہ اس مفکرِ اعظم نے دنیا میں جنم لیا۔ بچپن میں یہ

پیار سے "رابی" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ بدھ مت کے بانی سدھارتا کی طرح بہت ہی کمسنی میں ننھا سا دل ماں کے داغِ فرقت سے غمگین ہوگیا۔ ماں سے حصولِ تربیت کا بہت تھوڑا موقع ملا۔ اتنا بھی کافی تھا۔ اِن کے والد دن کا بیشتر حصّہ گھر سے باہر ہی گذارتے اور رابی نوکروں کی نگرانی میں چھوڑ دیے گئے تھے۔ وہ اپنا دل فطرت کے مناظر اور قدرت کے رنگینیوں سے بہلایا کرتے۔

کلکتہ میں ایک دفعہ سخت وبا پھیلی تو سب لوگوں کے ساتھ ان کے خاندان والے بھی شہر سے دُور گنگا کنارے آ ٹھہرے۔ ندی کنارے کے مناظر ان کے دل پر مقناطیسی اثر کرتے تھے پہلی دفعہ یہ طائرِ قفس قید کی بندشوں سے آزاد ہوکر زمین، آسمان، پہاڑ، دریا کی کیفیتوں اور درختوں کے پھول پتوں کی مستیوں اور رنگینیوں کی دنیا میں داخل ہوا۔ ٹیگور نے فطرت کا گہرا مطالعہ شروع کیا۔ اور اس میں اس قدر محو ہوگئے کہ گھنٹوں دریا کے پانی میں پیر لٹکائے کسی چٹان پر بیٹھے سوچتے رہتے۔ دریا کا تموج، پانی کا لہروں کی شکل میں بار بار اٹھ اٹھ کر ساحل کے سبزے سے اٹکھیلیاں کرنا، دن میں سورج کی شعاعوں سے لہروں کا چمکنا اور رات میں سطحِ آب پر چاندنی کا عکس ـــــ یہ سب ایسی چیزیں تھی کہ وہ اِن کو دیکھ کر اپنے دل میں ایک ہیجان محسوس کرتے۔ ٹیگور نے اِن کو دیکھ کر، قدرت اور وحدت کے گیت گانے شروع کیے۔

ابتدائی تعلیم | ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ جس انسان کو خدا نے اس لیے پیدا کیا ہو کہ وہ آگے چل کر قوم و ملک کا سچا خادم بنے اور انسانیت کو غلامی کے بندھنوں اور ظالمانہ پنجوں سے آزاد کرائے۔ بھلا وہ خود کیسے مدرسہ یا کالج کا اینٹ پتھر بن کر آزادی کو بیچ دیتا؟ وہ انسان جو آگے چل کر اوروں کو مفید تعلیم دینا چاہتا تھا کس طرح وہ خود مضرت رساں تعلیم کے پیچھے پڑ کر اپنی عمر برباد کرتا؟ یہی ہوا ـــ ٹیگور کو بچپن ہی سے مدرسہ کی خراب تعلیم سے نفرت ہو چلی تھی اور یہ نفرت بڑھتی ہی گئی حتیٰ کہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ کر یہ ایک ایسی تحریک کی ایجاد کا سبب بنی جو آج عالمگیر تحریک کہلانے کی مستحق ہے۔ یعنے شانتی نکیتن کے ادارہ کا وجود صرف اس لیے عمل میں آیا کہ ٹیگور کو موجودہ... قسم کی غلامی کی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ غرض ٹیگور نے ایسی تعلیم کو پسند نہیں کیا جو انسانی کردار میں اصلاح اور اس کے خیالات کو منور کرنے کی بجائے پستی کی طرف دھکیل رہی تھی۔ ان خیالات کی ابتدا خود ان کے تعلیمی زمانے سے ہوتی ہے۔ ابتداً یہ کسی چھوٹے پرائمری اسکول، میں داخل کیے گئے جہاں سے بہت جلد نارمل اسکول میں آئے عمر بہت ہی کم تھی۔ بچوں کی شرارت اور ترش رو اور بدمزاج استادوں نے انھیں اس طرف سے بددل کردیا۔ گھر پر استاد رکھا گیا لیکن تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

سب سے بڑھ کر انھوں نے فطرت کو معلم بنایا اور زندگی کے تلخ تجربات کو درسِ حیات قرار دے کر راہِ عمل پر گامزن ہوئے اور دنیائے ادب میں ایک بلند اور پر فضا مقام حاصل کیا اس طرح انھوں نے مدرسہ کی بے بنیاد مے بے سود اور بڑی حد تک مضرت رساں تعلیم سے بے بہرہ رہکر ہی ترقی کی۔

ہمالہ کا سفر | ان کے والد دیوندر ناتھ نے ہمالہ کی بلند چوٹیوں اور جنگل کی گہرائیوں کو اپنی قیام گاہ بنائے رکھا تھا۔ وہ وہیں رہکر کبھی کبھی گھر کی خبر لے لیا کرتے۔ جب رابی گیارہ سال کے تھے تو ان کے والد بچے کی کسی رسم کے سلسلہ میں کلکتہ آئے ہوئے تھے جاتے ہوئے رابی (ٹیگور) کو ساتھ لے لیا۔

دیوندر ناتھ موسیقی پر جان دیتے تھے۔ نورانی راتوں میں جب چاند اپنی مہتابی روشنی سے سارے عالم میں ایک رنگینی پیدا کرتا تو دیوندر ناتھ کا مسکن مرکزِ یاران بنا رہتا۔ رقص و سرود، گانے بجانے کی محفلیں گرم ہوتیں۔ کچھ تو اپنی فطرت کے مطابق اور کچھ ان حالات سے متاثر ہوکر ٹیگور کبھی کبھی والدِ ماجد کی فرمایش پر کچھ گا لیا کرتے۔ ٹیگور کو یہاں پوری آزادی تھی کہ جہاں چاہیں پھریں۔ دیو نما درخت اور پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں اِن کی دِل لگی کا باعث تھیں۔ وہ طائرِ پریشان کی طرح بیخود ہوکر ڈالی ڈالی جھوما کیے۔ یہ اور ایسی ہی بہت سی چیزیں اِن کی قربت میں تھیں۔ یہ اِن کو اس بات کا موقع دیتی تھیں کہ وہ فطرت سے متاثر ہوں۔

سفرِ لندن | بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ گھر میں بھاوج تھیں جو شاعری کی دلدادہ تھیں۔ محفلیں منعقد کر کے ننھے شاعر کو کلام کے سنانے کا موقع دیتیں۔ سب لوگ تعریف کر کے اِن کی ہمّت افزائی کرتے۔ اکشیا چودھری ایم۔ اے اِن کے بڑے بھائی کے دوست اِن کے بھی رفیق تھے۔ اور ٹیگور کی شاعری انہی کی توجہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ٹیگور کو بنگالی ادب کے اچھے اچھے نمونے سناتے اور پھر ان کا کلام بھی سن کر اس کی تعریف کرتے۔ ٹیگور اپنے بڑے بھائی جیوندر ناتھ کے تحت نکلنے والے رسالے "بھارتی" کو اپنے مضامین سے .... مزیّن کرتے۔ رفتہ رفتہ ان کے ذوق شاعری کی خبر گھر کے بزرگوں تک پہنچی اور یہ گھر سے نکل کر منظرِ عام پر آنے لگے۔

جب ان کے بڑوں نے دیکھا کہ یہ شخص عزت و شہرت کے آسمان پر چاند، سورج بن کر سارے عالم کو روشنی پہنچانے والا ہے تو خیال ہوا کہ یہ جامعہ کی کوئی ڈگری حاصل کر لے۔ ان کے بھائی احمد آباد کے جج تھے۔ جن کے بیوی بچّے انگلستان میں مقیم تھے۔ ٹیگور نے ۲۰ ستمبر ۱۸۷۸ء کو بھائی کے ساتھ سمندر پار کا سفر کرنے کے لیے ساحلِ ہند کو خیرباد کہا۔ بیرسٹری کا امتحان کامیاب کرنا بزرگوں کا مقصد تھا۔ تعلیم کی طرف، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے رجحان بہت ہی کم تھا۔ کیونکہ اس کے متعلق ان کے تاثرات برے لیکن صحیح تھے۔ اِس لیے انھوں نے کسی ڈگری کے حصول میں کامیابی حا

نہ کی اور ۲۴ نومبر ۱۸۸۰ء کو جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس ہوئے۔ یہاں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ ٹیگور نے انگلستان میں رہایش کا زمانہ لہوولعب میں گزارا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ٹیگور کا قیامِ انگلستان تعیشات کی زندگی سے مبرّا تھا۔ اِس کو صاف طور پر انھوں نے 'لیٹرس آف اے وِزیٹر ٹو یورپ' میں دکھایا ہے۔ سفرِ یورپ سے اِن کے خیالات نے صرف ایک اِرتقائی منزل یہ طے کی کہ انھیں انگریزی ادب نے متاثر کیا اگرچہ ان کو بنگالی سے جو ان کی مادری زبان تھی، اُنس تھا لیکن ساتھ ہی وہ اوروں کی طرح متعصب بھی نہ تھے۔ ہر اچھی چیز کو اچھی کہنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ غرض انھیں انگریزی ادب سے کسی قدر رغبت ہوگئی۔ اِس سفر نے ان کی ادبی سرگرمیوں میں کسی طرح رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ وہ برابر اپنا کام کرتے رہے۔ "دلِ شکستہ" کے نام سے ایک نظم لکھی جس کو انھوں نے ابتدائے سفر ہی میں شروع کیا تھا لیکن یہ ہندوستان کو واپسی کے بعد مکمل ہوئی۔ اس نظم میں عشق و جوانی کی باتیں ہیں۔

کوئی شخص ٹیگور کی شخصیت کو صرف ایک ہی رنگ میں دیکھ کر اس کے متعلق اندازہ قایم کرے تو یہ فاش غلطی ہے۔ اگر ایک تصوف پرست، جو ٹیگور کے فلسفہ کی تعریف کرتا ہے اس نظم "دلِ شکستہ" کو دیکھ لے تو وہ خفا نہ ہو کیونکہ ٹیگور بھی کبھی جوان تھا۔ وہ اِنسان تھا اور اس میں بھی جذبات تھے۔

نیا دور | اب شاعر کی کتابِ زندگی کا ایک دوسرا ورق اُلٹتا ہے۔ ماہِ دسمبر ۱۸۸۳ء میں جبکہ ان کے بھائی کاروار میں کسی خدمت پر مامور تھے، ٹیگور کی شادی کر دی گئی ادبی ذوق میں یہ چیز حائل ہونے نہ پائی کیونکہ کاروار کے دورانِ قیام ہی میں انھوں نے "سنیاسی" ڈراما لکھا اور کلکتہ آکر غنائی نظموں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ "مباحثے" تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ شایع کیا۔ "راج رشی" ناول لکھا۔ "مایا کھیلا" جو والمیکی سے مشابہ ہے اسی زمانے میں لکھا گیا۔ "مباحثے" کے عنوان سے دوبارہ ایک مجموعہ شایع کیا گیا۔ اور اس میں سیاسی، معاشرتی، سماجی اور تعلیمی مسائل پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ "سنیاسی" ڈراما (جو کاروار میں لکھا گیا) میں بتلایا گیا ہے کہ اِنسان کا ترکِ دنیا کا خیال بالکل موہوم ہے اور یہ کہ کس طرح ایک ریاضت کرنے والا سنیاسی آخرکار ایک دوشیزہ کی ارضی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ڈراما اگر ایک طرف خود شاعر کی جوانی کے جذبات کا ترجمان دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف سنیاسیوں کی زندگی کے ظاہر و باطن پر روشنی ڈالتا ہے۔

جاگیر کا انتظام | شادی سے واپسی کے بعد ۱۸۹۰ء میں ٹیگور کے والد نے انھیں "شیلڈا" جاگیر میں انتظامات کرنے کے لیے بھیجا۔ پہلے تو ٹیگور کام کے نام سے گھبرا گئے لیکن پھر رضامندی ظاہر کی اور جاگیر جانے سے پہلے دوبارہ یورپ کا عزم کیا۔ اس وقت بھی بعضوں کا خیال تھا کہ وہ بیرسٹری کی ڈگری

حاصل کریں لیکن آزادمنش اور کھلی فضاؤں میں سانس لینے والے کو قانون اور ضابطوں کی قید کیسے محصور کر سکتی تھی ؟ پھر وہی حشر ہوا اور ٹیگور پہلے کی طرح ہی واپس ہو گئے۔ البتہ اس دفعہ جو نئی چیز انھوں نے حاصل کی وہ جرمن اور یورپی موسیقی تھی۔ واپس آکر اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں شیلڈا جاگیر کو روانہ ہوئے اور وہاں جاکر دنیا والوں کو دکھلا دیا کہ وہ صرف باتوں کے آدمی نہیں تھے بلکہ کچھ کام کرنا بھی آتا ہے۔ نازونعم میں پرورش پانے کے باوجود بھی ٹیگور نے کبھی اپنی جاگیر میں زرداری اور مزدوری میں فرق نہ کیا بلکہ بلاتامل غریب اور مفلوک الحال کسانوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔ ان کی زندگی سے وہ متاثر ہوتے اب یہاں عملی زندگی دیکھی۔ جواب تک ان کے لیے نئی تھی۔ زندگی کی حقیقت پر نظر پڑی۔ اس کا اثر ان کی اس دوران قیام کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ غرض وہ کسانوں کے دکھ اور سکھ میں برابر کے شریک رہتے۔ جہاں انھوں نے اس میل جول سے فائدہ اٹھاکر اپنی جاگیر کی آمدنی میں اضافہ کیا تو وہیں زراعت کے نئے نئے اصولوں پر پرانی لکیر کے فقیر کسانوں کو کام کرنا سکھلایا۔ امداد باہمی کی تحریک کو رواج دیکر ان کی سب سے بڑی کمزوری یعنی قرض کو دور کیا۔

سنہ ۱۹۰۱ء وہ مبارک سال ہے جبکہ شاعر نے اپنے آشرم کی بنیاد رکھی۔ کلکتہ سے ۹۳ میل کے فاصلہ پر بول پور میں شانتی نکیتن کا ادارہ قایم کیا گیا جو آج بین الاقوامی جامعہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہاں بچوں کی تربیت میں فطرت کا زبردست ہاتھ کارفرما ہے۔

سال سنہ ۱۹۰۲ء شاعر کی عمر کا وہ سال ہے جس میں غم و اندوہ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس سال مسلسل اموات واقع ہوئیں۔ ان کی محبوب بیوی جن کا سولہ سال کا ساتھ رہ چکا تھا' عالم شباب ہی میں اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس غم کو بھلانے کے لیے انھوں نے لاڈلی بیٹی کو بستر مرگ پر چھوڑا اور ہمالیہ کی ترائیوں کو روانہ ہوئے۔ ایک کمسن لڑکا بھی تھا جو اُن کے ہمالیہ کی طرف جانے کے بعد چل بسا "کتھا" کی اکثر مثنویاں اسی بچے کی خاطر لکھی گئیں۔ "سماراں" کے نام سے حزنیہ نظموں کا سلسلہ شروع کیا چونکہ یہ نظمیں ایک اندوہگیں شاعر نے لکھی ہیں اس لیے بہت دردناک اور پُرتاثیر ہیں۔

علحدگی بنگال | سنہ ۱۹۰۵ء کا زمانہ سیاسی تاریخ بنگالہ میں بڑا ہی پُرآشوب ہے۔ لارڈ کرزن وائسرائے وقت نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز کی :۔ (۱) مشرقی۔ (۲) مغربی۔ تاکہ وہاں کے گورنر کو تقسیم کار کے اس طریقہ سے سہولت ہو۔ یہ تو ظاہری مقصد بتلایا گیا لیکن در پردہ کچھ اور بات تھی۔ بنگالیوں نے فوراً اس بات کو محسوس کرلیا کہ اس طریقہ سے ان کو دو گروہوں میں تقسیم

کر دیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ان کی متحدہ قوت کو بھی۔ اسی لیے ہر شخص نے اس کے خلاف اپنے جذباتِ مخالفت کا اظہار شروع کیا۔ مظاہرے کیے گئے کہ وہ ہرگز ہرگز دو ٹکریوں میں بٹنے تیار نہ تھے۔ جب ٹیگور نے دیکھا کہ اس سیاست کا گہرا اثر ہندوستانی زندگی پر پڑ رہا ہے تو وہ بھی اس آگ میں کود پڑے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ سارے ہندوستان میں کسی کی آواز ٹیگور کی سی طاقتور تھی اور نہ کسی قلم میں یہ قوت کہ وہ اقتدار کو ایسا کرنے سے باز رکھے۔

نوبل انعام | سال ۱۹۱۳ء تاریخ ہند میں سنہری الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے جب کہ ٹیگور کی قابلیت دنیا کے کسی حصے اور کسی گوشہ میں بھی محتاجِ تعارف نہ رہی۔ ساری دنیا میں شاعر کی قابلیت کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ دنیا نے انہیں نوبل انعام دے کر ادبیات کی بادشاہت کا تاج سر پر رکھا۔ نوبل انعام مالیتی آٹھ ہزار پونڈ یا ایک لاکھ بیس ہزار روپے صرف ایسے ادیب کو ملتا ہے جس کی کوئی تصنیف دنیائے ادب میں خاص مرتبہ رکھتی اور قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ یہ پہلا وقت تھا جب کہ ایک کالے آدمی کو نوبل انعام ملا۔ یہ انعام ان کی مشہور تصنیف "گیتان جلی" پر ملا۔ گویا ٹیگور اب آسمانِ عزت و شہرت پر چاند سورج بن کر چمکنے لگا۔ جس جامعہ کلکتہ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری پیش کرنے کی تحریک کو اس وجہ سے رد کر دیا کہ ٹیگور غلط بنگالی لکھتا ہے اس نے اپنے اس ہدیہ کو پیش کرنا قابلِ فخر سمجھا۔ ٹیگور نے ازراہِ نوازش اس کو قبول کر کے جامعہ کلکتہ کو عزت بخشی۔ ۱۹۱۴ء میں حکومت کی جانب سے "سر" کا خطاب ملا۔

مسٹر ٹامسن لکھتے ہیں کہ جب عطائے نوبل انعام کا تار آیا تو وہ شاعر کے مہمان تھے۔ اس خبر کو سنتے ہی اور دنیا والوں کی طرح خوش ہونے کی بجائے ٹیگور پر یاسیت کی حالت طاری ہو گئی اور انھوں نے کہا۔ "اب میرا سکون جاتا رہا" کیونکہ شاعر دنیوی دولت کو روحانی زندگی میں خلل انداز تصور کرتے ہیں۔

جب نوبل انعام دے کر شہرت میں چار چاند لگا دیے گئے تو ساری دنیا سے دعوت نامے آنے لگے۔ سب آنکھیں بچھانے تیار بیٹھے تھے کہ کب یہ آئیں تو اپنا ہدیہ پیش کریں۔ اور ان کی تقریروں سے مستفید ہوں۔

۱۹۱۹ء میں ٹیگور نے جلیانوالا باغ کی کارروائیوں سے متاثر ہو کر اس کے خلاف احتجاجاً اپنا "سر" کا خطاب واپس کر دیا۔

۱۹۴۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ٹیگور کی خدمت میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری پیش کی جس کو انھوں نے خوشی سے قبول کر لیا اور کسی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے علی الاعلان یہ کہہ دیا کہ

"میں اس پیشکش کو صرف اِس لیے قبول کر رہا ہوں کہ شاید یہ خوش آئند مستقبل کا پیش خیمہ ہو۔ اور دوستانہ تعلقات کی استواری ہو"

تصانیف | ٹیگور کی صِرف چند اہم تصانیف کا یہاں ذِکر کیا جائیگا:۔

گیتان جلی (نذرِ نغمہ) ۱۹۱۳ء ۔ دی کرسنٹ مون (ماہِ نو) ۱۹۱۳ء۔
چترا ۱۹۱۴ء ۔ ڈاک گھر ۱۹۱۴ء ۔ باغبان ۱۹۱۴ء ۔
کبیر کی ایکہزار نظمیں ۱۹۱۵ء ۔ فروٹ گیادرنگ ۱۹۱۵ء۔
اسٹرے برڈ (طائرِ پریشاں) ۱۹۱۶ء۔
دی لَوَرس گِفٹ اینڈ کراسنگ ۱۹۱۸ء ۔ نیشنلزم ۱۹۱۷ء ۔
دی ہوم اینڈ دی ورلڈ (گھر اور دنیا) ۱۹۱۹ء ۔
شکنتلا ۱۹۲۰ء ۔

رحلت | دنیا کے اس مفکر اعظم نے، اگست ۱۹۴۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم نے اس کی موت پر ماتم کیا ۔ اس نے پچاسوں تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔ اور خود شانتی نکیتن ہی ایک ہی ایسی جاودانی یادگار ہے کہ شاعر کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

چمنِ شانتی نکیتن سے ایسے ایسے باکمال اور ہنرمند سپوت پیدا ہونگے جو اپنی مہک سے گلستانِ عالم کی فضاؤں کو مخمور کرکے چپ چاپ اہلِ باطن کو اپنے باغبان کی یاد دلائینگے۔

افتخار احمد
متعلم جماعت دہم

ٹیگور کی ادبی خدمات

ٹیگور نے آٹھ سال کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کیا تھا وہ اپنے اشعار کو اپنی نیلی بیاض میں نقل کرلیا کرتے۔ استاد، ساتھی اور گھر والے اِس ننھے راہی کے اشعار بہ شوق سنا کرتے۔ آپ کے استاد گوبند بابو محظوظ ہوکر فرماتے۔ "اِس ہونہار نوخیز شاعر میں بھارت ماتا نے مہاکوی کا جنم دیا ہے۔"

ٹیگور کا حِسّ موسیقی پہلے ہی سے تیز تھا چنانچہ نئے گیتوں کو راگوں میں الاپتے۔ اپنے اشعار کی اصلاح دھاری لال چکرورتی سے کرواتے سب سے پہلے انہوں نے "کنول" پر ایک نظم لکھی اور چودھویں سال میں ان کی ایک طویل نظم "کوی کہانی" (سرگزشت شاعر) بنگال کے مشہور رسالہ بھارتی میں شایع ہوئی۔ ٹیگور کا یہ سب سے پہلا ادبی کارنامہ ہے جو منظرِ عام پر آیا۔ اِس کے بعد رسالۂ "گیا نکر" میں بھی آپ کی نظمیں شایع ہونے لگیں۔ آپ نے "بھنو سنگھ" کے فرضی نام پر کئی ایک نظمیں لکھیں۔ آپ کے ابتدائی کلام میں قدامت کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔

۲۰ ستمبر ۱۸۷۸ء میں اپنے بھائی کے ہمراہ لندن روانہ ہوئے اِس سفر کا مقصد بیرسٹری کا اِمتحان پاس کرنا تھا مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس دَور کا نثری کارنامہ زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ دورانِ سفر میں اپنی ایک طویل نظم بعنوان "دِل شکستہ" لکھی۔ ۱۸۸۰ء میں واپس ہوئے۔ ۱۹۱۲ء کے موسم بہار میں اقطاعِ عالم کی سیاحت کے لیے ساحلِ ہند کو خیرباد کہا اور برّاعظم یورپ و امریکہ، چین و جاپان اور جزائرِ شرق الہند کی سیاحت کی۔ اِن ممالک کی ممتاز یونیورسٹیوں نے آپ کو مدعو کیا۔ اور ہر جگہ آپ نے فلسفیانہ لکچر دیئے اور اپنی قابلیت کا سکّہ ساری دنیا پر جمادیا۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے ایک آشرم کی بنا ڈالی جو شانتی نکیتن کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا مقصود نظر قدیم ہندوستانی طرزِ تعلیم کا احیاء اور طالبعلموں کو

مقدس مقاصدِ حیات سے روشناس کراتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے وہ نہ صرف ادیب بلکہ ماہرِ تعلیم بھی ہیں۔

"نیا پھول" ان کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ہے اس کے بعد انھوں نے ایک منظوم افسانہ "کوکا تھا" لکھا۔ "بھنوسنگھ" پر تقریباً بیس نظمیں لکھیں۔ اس وقت تک ان کے اندازِ بیان میں کافی دِلکشی آچکی تھی انگلستان سے واپس آنے کے بعد ایک ناول "ونا ولو" شایع ہوا۔ پھر "رودرا چندرا" عوام کے ہاتھوں پہنچا۔ اس کے بعد مذکورہ نظم "دلِ شکستہ" کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کتاب نے کافی مقبولیت پائی۔ "شام کے گیت" نے ٹیگور کو منظر نگار اور جدت طراز شاعر ثابت کر دیا۔ دو غنائی طربیے "والمیکی کی ذہانت" اور "خوش قسمت نِسکار" نکلے۔ "صبح کے گیت" کی اشاعت ٹیگور کی ادبی قابلیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اجیت کار چکرورتی جو ٹیگور کے بڑے نقادوں میں ہیں ان کا بیان ہے کہ "یہ کتاب ان کی پوری تصنیفات پر روشنی ڈالتی ہے۔"

دسمبر ۱۸۸۳ء میں تئیس سال کی عمر میں ٹیگور کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد بابو موہت چندرسنگھ نے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "وحشتِ دل" شایع کیا۔ اس کے بعد کاروار کے قیام کے زمانہ میں ایک ڈرامہ "انتقامِ فطرت" لکھا۔ یہ ڈرامہ اپنے اندازِ بیان کے لحاظ سے قابلِ قدر و لائقِ مطالعہ ہے۔ اِس کے بعد ہی "نغمات و تصاویر" کے نام سے آپ کی تغزل آمیز نظموں کا مجموعہ شایع ہوا۔ ایک مختصر سا ڈراما "نلینی" چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

اب رابندر ناتھ کا اشہبِ قلم مختلف شعبہ ہائے ادب میں دوڑنے لگا۔ چنانچہ آپ نے اپنا پہلا ڈراما "قربانی لکھا۔" "نغمات و تصاویر" کے سلسلہ کی دوسری کڑی "شاریں و فلاش" نظموں کا ایک اور مجموعہ شایع ہوا۔ اس کی اشاعت نے ٹیگور کی شاعرانہ صلاحیتوں اور رجحانات کو زیادہ اجاگر کر دیا۔ ۱۸۸۹ء میں "راجہ رانی" کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ اپنی موسیقیت اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بہت مقبول ہوا۔ غازی پور کے دورانِ قیام میں وہاں کی دلفریبیوں سے متاثر ہو کر ٹیگور نے کئی نظمیں لکھیں جن کا مجموعہ "اظہار" کے نام سے چھاپا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں وہ اپنی خاندانی جائداد پر نگرانی رکھنے کے لیے بادلِ ناخواستہ تعمیلِ حکم کی خاطر شیلڈا چلے آئے۔ لیکن اس وقت بھی وہ علمی اور ادبی خدمت سے غافل نہ رہے۔ قیام شیلڈا کے ابتدائی ۵ سال "سادھنا عہد" سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ "سادھنا" بنگال کا ایک مشہور ادبی رسالہ ہے جس نے آگے چل کر "بھارتی" کا روپ لیا۔ اس کا بڑا حصّہ ٹیگور کی تحریروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے "عناصرِ خمسہ" لکھی اور ساتھ ہی ساتھ کئی مضامین اور کہانیوں میں اپنے سماج پر چوٹیں کی ہیں۔ ۱۸۹۱ء سے کہانیوں کا سلسلہ

شروع ہوتا ہے۔ "چترا" اسی عہد کی پیداوار ہے اس کے بعد ایک ایکٹ کے ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔ انہی دنوں میں شاعر کی بیوی، بیٹی اور بیٹے نے دائمی مفارقت کا داغ دیا اور شاعر روحانیت اور مذہب کی طرف مائل ہوگیا۔ اس کا ثبوت "گیتانجلی" ہے اس کا طرۂ امتیاز فطرت کی صحیح، سادہ اور پُر اثر ترجمانی ہیں جس میں فلسفہ اور روحانی رنگ غالب ہے۔ یہ کتاب شاعری کے جملہ محاسن سے مالامال ہے۔ اسی کتاب پر شاعر کو ادبیات کا نوبل پرائز ملا جس کا اعلان حسبِ ذیل الفاظ میں کیا گیا۔ "ان معنوی گہرائیوں اور بلند عزایم کے لیے جو ان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں نیز مسلمہ مغربی ادب میں اپنے مشرقی تخیلات کو مع اپنی تمام خوبیوں اور دلفریبیوں کے ترجمہ کرنے کی ماہرانہ قابلیت پر رابندر ناتھ ٹیگور کو ۱۹۱۳ء میں ادب کے لیے نوبل پرائز کا مستحق قرار دیا جاتا ہے" اس عظیم المرتبت اعزاز کے حاصل کرنے والوں میں یہ پہلے ہندوستانی ہیں۔

۱۹۱۵ء کے بعد سے شاعر نے اپنی بیش بہا بنگالی نظموں اور تحریروں کو انگریزی جامہ پہنانا شروع کیا۔ چنانچہ "قومیت"، "فریدۂ اتحاد" اور "باقیات" جیسی کتابیں منظرِ عام پر آئیں ناولوں کے سلسلہ میں دو نام "گورا" اور "تباہی" زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ڈرامے کے سلسلہ میں "پوسٹ آفیس"، "ایوانِ تاریک کا بادشاہ" اور "گل کدہ" بہت ہی مقبول ہیں۔

غرض کہ ٹیگور ہندوستان کا سب سے بڑا ادیب اور شاعر تھا۔ کبھی تو وہ اعلیٰ ترین نثر نگار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی باکمال شاعر بن کر۔ اس کا کلام حقایق و معارف سے مملو ہے اور ہر چیز میں حُسن کاری، شاعری، اور موسیقی جاری و ساری نظر آتی ہے۔ شاعر کی تعلیم سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالی تھی جس پر وہ عمر بھر عمل پیرا رہا۔ وہ شیریں کلام شاعر، سحر نگار ادیب جادو بیان مقرر، بلند پایہ فلسفی اور ایک پُرجوش قوم پرست تھا۔ گو آج وہ ہم میں نہیں لیکن اس کے ادبی کارنامے ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

محمد علی ناصری

متعلم جماعت دہم

شانتی نکتین

ترانہ

[یہ وہ ترانہ ہے جس سے روزانہ شانتی نکتین کالج کا آغاز ہوتا ہے بنگالی ادب سے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوا ۔ اس انگریزی ترجمہ کا آزاد اردو ترجمہ درج ذیل ہے ۔]

اس کا (شانتی نکتین کا) تعلق ہماری ذات سے ہے اور اسے ہم اپنے دل سے چاہتے ہیں۔
ہمارے خواب اس کے بازوؤں میں جھولتے ہیں ۔
اس کا چہرہ تازہ اور محبت سے ماموں ہے ہم اسے ہر بار دیکھتے ہیں۔
کیونکہ اس کا تعلق ہماری ذات سے ہے اور اسے ہم اپنے دل سے چاہتے ہیں۔
اس کے درختوں کے سایہ میں ہم ملاقات کرتے ہیں۔
اس کی صبح اور اس کی شام ۔
(اپنے ساتھ) بہشتی پیار لاتی ہے ۔
اس طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کا تعلق ہماری ذات سے ہے اور اسے ہم اپنے دل سے چاہتے ہیں۔
اس کی چھاؤں کا سناٹا درختوں کی کانا پھوسی میں مصروف ہے ۔
اس کے درخت پتوں کی بے خودی سے واقف ہیں ۔
یہ (شانتی نکتین) ہم میں ہے اور ہمارے آس پاس بسا ہوا ہے خواہ ہم کتنی ہی دور کیوں نہ گشت کریں۔
موسیقی کا شیدا بنانے والے گیت کی مانند یہ ہمارے دلوں کو موہ لیتا ہے ۔

(اور) ہمارے الفت کے سازوں کو اپنی انگلیوں سے چھیڑتا ہے۔
اور ہم ہمیشہ یہی جانتے ہیں کہ اس کا تعلق ہماری ذات سے ہے اور اسے ہم اپنے دل سے چاہتے ہیں۔

شانتی نکیتن اسکول کے آغاز کے متعلق شاعر ٹیگور کے خیالات

"تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کے قدیم معلمین وہ جنگل کے باشندے تھے جو کسی تالاب کے سایہ دار کناروں کے آس پاس پڑاؤ ڈال کر آگ سینکا کرتے اور مویشی پال پوس کر جنگلی غذاؤں سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھرتے، ارواح اور طاقتوں کو خدا مانتے اور اسی طرح آزادی اور امن کے ساتھ قدرتی اشیا کے سایہ میں رہا کرتے تھے۔ اب بھی یہ تصویر بعض اوقات شعراء کے کلام میں نظر آسکتی ہے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلے دنیا چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹنے لگی جنگل شہروں میں تبدیل ہوتے گئے اور تہذیب و تمدن کچھ اتنا بڑھ گیا کہ قدیم دنیا کا تخیل بھی دنیا کے دماغ سے محو ہو گیا۔
اس ترقی یافتہ دور میں مجھے خواہش پیدا ہوئی کہ ایک بار اس دور قدیم کو دیکھوں۔ پھر وہی قدیم صداقت امن آزادی تاریخ تمدن دوبارہ اپنا جائزہ حاصل کریں۔ میرے ضمیر نے گواہی دی کہ میری خواہش صداقت کا جذبہ لیے ہوئے ہے تہذیبِ جدید کی بعض خامیاں میری نظروں میں پھرنے لگیں اور قدیم تمدن کو دیکھنے کا جذبہ مجھے زور دے رہا تھا مجھے مقدس زبان میں چو طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں اور یہ آوازیں مجھے میرے ملک سے قریب کرنے لگیں اور میں تنہائی میں خیالات کو غور کرنے کے لیے "شانتی نکیتن" جانے لگا یہ وہ مقام تھا جہاں میرے والد دیوندر ناتھ آنجہانی نے گذشتہ صدی کے وسط سے کچھ عرصہ قبل ایک آشرم کی بنیاد اس مقصد کے تحت ڈالی تھی کہ یہاں خدا پرست مغربی مادہ پرستی کے طوفان سے محفوظ رہ کر معبود کی یاد میں مصروف رہیں۔ غرض بیسویں صدی کے آغاز میں میں نے اس آشرم میں ایک اسکول کی بنیاد ڈال دی۔ یہاں طلباء گھر اور عبادت خانہ میں فرق محسوس نہیں کرتے اور قدرت کا مطالعہ کرتے ہیں خدا کی حمد اس لیے اثر کن ہوتی ہے کہ اس کی بنائی ہوئی چیزوں ہی کی تعریف کی جاتی ہے۔"

شانتی نکیتن کی کہانی ایک استاد کی زبانی

مسٹر پیرسن کہتے ہیں کہ :- ۱۹۱۲ء میں میں نے بول پور کا پہلا سفر کیا تھا بول پور کلکتہ سے ۹۸ اور شانتی نکیتن بول پور سے ڈیڑھ میل دور ہے۔
میں بول پور سرِ شام پہنچا مدرسہ کے استاد اور چار قدیم طلباء نے میرا سامان سنبھالا اور ایک بیل گاڑی میں ہم سب سوار ہوئے میں چونکہ ایک عرصہ تک لندن میں مقیم رہا اور وہاں مجھے ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور سے شرف ملاقات بھی حاصل تھا اس لیے راستہ تمام انہی سے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ ماسٹر صاحب ان قدیم طلباء میں سے ایک تھے جنھوں نے اس مدرسہ کے آغاز کے وقت تعلیم پائی تھی انھوں نے اب کالج کا

نصاب ختم کرکے صرف اسکول کے لیے اپنی زندگی یہاں وقف کر دی تھی۔ میں نے ان سے شاعر کے خیالات معلوم کرنے چاہے اسی وقت مجھے لڑکوں کی آواز سنائی دی یہ کوئی گیت گا رہے تھے گویا ہم اسکول پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ متعلمین شام کے کھانے سے فارغ ہوئے ہیں۔ کچھ دیر بعد یہ بستروں پر دراز ہو گئے اور تمام اسکول پر خاموشی طاری ہو گئی اب مجھے اسکول کے نام یعنی شانتی نکیتن (بیت الامن) کے معنیٰ سمجھ میں آئے۔

صبح سویرے سویرے تمام طلباء ایک گیت کے ذریعہ بیدار کروائے گئے اس کے بعد ہم پڑوس کے ایک گاؤں کو تفریحاً گئے معلوم ہوا کہ اس گاؤں کے باشندوں کو شانتی نکیتن کے طلباء راتوں میں درس دیا کرتے ہیں۔

عبادت اس کے بعد ہم ایک عبادت خانہ میں گئے جو کھلی فضا میں واقع تھا یہاں اکثر طلباء اپنے مخصوص شالوں میں ملبوس یا تو عبادت گھر کے اندر یا باہر پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔
بنگالی زبان کے ایک گیت سے عبادت کا آغاز ہوا اس گیت کے آخری بول تھے "اوم شانتی شانتی" پہلی بار بنگالی ادب کا گیت سننے میں جو لطف آیا وہ عمر بھر بھلایا نہ جاسکیگا۔ عبادت بالکل کم وقفہ میں ختم ہوئی ایک مذہبی تقریر کے بعد ایک دعا پڑھی گئی اور عبادت ختم ہوئی۔
عبادت گاہ میں کسی قسم کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جو عام مندروں میں ہوا کرتی ہے کیونکہ آشرم کے بانی دیوندر ناتھ آنجہانی کا قول تھا کہ آشرم میں مذہبی جھگڑے نہ پالے جائیں یہاں صرف ایک خالق کی تعظیم و تکریم کی جائے اور عالمی بھائی چارہ کا درس ملے۔

قابل اساتذہ دن میں میری ملاقات یہاں کے قابل اساتذہ سے ہوئی۔ شاعر کے بھتیجے مسٹر دنیند ناتھ ٹیگور شاعری کی نظموں کا مطلب طلباء کو سمجھاتے ہیں باقی اساتذہ بھی غیر معمولی شخصیتوں کے لوگ ہیں ٹیگور نے انہیں دنیا کے گوشے گوشے سے کھینچ بلایا ہے آرٹ کا استاد جدید ہندوستان کا سب سے بڑا آرٹسٹ ہے ایک سال سنسکرت کا پروفیسر ایک فرانسیسی تھا جو عالمگیر شہرت رکھتا تھا۔ اٹلی کے رائل اکیڈمی کا نائب صدر یہاں پروفیسر رہ چکا ہے، انگریز، جرمن، چینی اور جاپانی اساتذہ تو مستقل ہیں۔

اساتذہ اور طلباء طلباء کو مکمل آزادی ہے کہ سبق کے دوران میں اساتذہ سے جس قسم کے چاہے سوالات کریں سبق کے اختتام کے بعد لڑکے اور اساتذہ ساتھ ساتھ اپنے گھروں کو باتیں کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ میرے سوال پر کہ اس قسم کی غیر معمولی بے تکلفی سے استاد کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا؟

لڑکوں نے جواب دیا "ہرگز نہیں ہمارے پروفیسر عام اساتذہ کی طرح نہیں ہوتے وہ ہر چیز کی تشریح کرتے ہیں، کسی چیز کا حکم نہیں دیتے وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں" یہاں کے تمام اساتذہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اسکول کے احاطہ ہی میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اسکول کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا جس کا ذکر میں آگے کرونگا۔

رخصتی رسوم دوسری صبح میں رخصت ہونے والا تھا اس لیے یہاں کے رسوم کے مطابق مجھے پھول پہنائے گئے اور ایک پھولوں کا گلدستہ جس میں ہمہ اقسام کے پھول تھے مجھے دیا گیا اور ان الفاظ کے ساتھ مجھے رخصت کیا گیا "خدا تمہارا سفر کامیاب کرے اور دعا ہے کہ تم اپنے مقصد میں پورے اترو" اسٹیشن روانہ ہونے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ زندگی کا حقیقی لطف آشرم کی خدمت میں ہے اس لیے میں نے اپنی زندگی کا بقیہ حصہ آشرم میں گزارنے کا تہیّہ کرلیا۔

ہماری ضروریات سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آشرم کے کامیاب شدہ طلباء تہذیب جدید کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صرف ایسے طلباء جو قدیم تہذیب کا سبق صحت افزا مقامات میں حاصل کرتے ہیں کچھ جان سکتے ہیں کہ تہذیب جدید کو کس چیز کی ضرورت ہے۔

شرکت اسکول میں چھ سال سے اٹھارہ سال تک کے طلباء شریک کیے جاتے ہیں۔ تعصب اور مذہبی معاملات کو یہاں دخل نہیں۔

اخراجات تمام طلباء کو مساوی فیس ادا کرنی پڑتی ہے مخصوص غریب طلباء کو مفت درس دیا جاتا ہے ہر طالب علم تیس شلنگ ماہانہ فیس ادا کرتا ہے اس میں رہائش اور طعام وغیرہ کے اخراجات شامل ہیں، مگر یہ حقیقی اخراجات نہیں بلکہ زاید اخراجات شاعر اپنی ذات سے ادا کرتے ہیں۔

نظام الاوقات صبح شاعر کے گیت سے طلباء کو بیدار کیا جاتا ہے جس کے بعد وہ غسل سے فارغ ہوکر ناشتہ کرتے ہیں صبح سات بجے سے درس کا آغاز ہوتا ہے ساڑھے گیارہ بجے طلبا کھانا کھا کر اپنے اسباق یاد کرتے ہیں۔ پھر دو بجے سے ساڑھے چار یا پانچ بجے تک تعلیم ہوتی ہے۔

کھیل فٹ بال یہاں کا محبوب میدانی کھیل ہے جس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہاں میدان بہت زیادہ ہیں، سوائے تعطیلات اور موسم باراں کے روز آنہ شام کے پانچ بجے سے طلبا فٹ بال کھیلتے نظر آتے ہیں۔

شام کے کھانے سے قبل ایک گھنٹہ کا وقفہ دیا جاتا ہے جو عموماً بعض دلچسپیوں مثلاً قصّہ گوئی وغیرہ میں صرف ہوتا ہے ساڑھے نو بجے تمام طلباء سوجاتے ہیں۔

نصاب انگریزی ادب کی تعلیم ابتدائی جماعتوں میں فرضی قصّے اور کہانیوں کے پڑھانے اور سنانے سے ہوتی ہے اور اعلیٰ جماعتوں کا نصاب وہی ہے جن سے عام طور پر ڈپلوما یا ڈگریاں مل جاتی ہیں۔

نظامِ درس چونکہ جماعتوں کے لیے کوئی کمرے نہیں ہیں اس لیے کھلے میدانوں میں تعلیم دی جاتی ہے ہر طالب علم اپنے ساتھ ایک کپڑے کا چوکور ٹکڑا لا لیتا ہے اور قدرت کی عطا کی ہوئی فضا میں ایسا سبق حاصل کرتا ہے جو کبھی بھُولا یا بھلایا نہیں جا سکتا۔ درس کے لیے کسی قسم کے فرنیچر وغیرہ کی ضرورت نہیں۔

چاندنی راتیں چاندنی راتوں میں طلبا تفریح کو جاتے ہیں اور اسکول سے دور کہیں جاکر کہانیوں وغیرہ کے کہنے میں اوقات بسر کرتے ہیں عموماً طلباء ایک ایسے مقام کو جاتے ہیں جہاں ابتدا میں دیوندر ناتھ آنجہانی جایا کرتے تھے اور جوان کی تفریح گاہیں رہ چکے تھے یہیں چاندنی راتوں میں آنجہانی کے تذکرے کیا کرتے ہیں۔

امتحانات امتحانوں کے موقعہ پر طلباء کو اپنی ذمہ داری پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ درختوں کے اُوپر، سایوں کے تلے طلباء جوابات کی بیاض لکھتے نظر آتے ہیں مگر طلباء اپنی ذمہ داری کا غلط استعمال نہیں کرتے۔

انجمن طلباء اپنی انجمن آپ بناتے ہیں اور انتخابات عمل میں لاتے ہیں اور اپنے قوانین بھی آپ ہی بناتے ہیں اور ہر طالب علم پر لازم ہے کہ وہ انجمن کی ہدایتوں پر عمل کرے۔

تفریحی سفر تفریحی سفر کے لیے یا تو سارے کے سارے طلباء کسی تاریخی مقام کے معائنہ کے لیے جاتے ہیں یا پھر ایک مخصوص جماعت اجازت لے کر کسی قریبی گاؤں کو جاتی اور پھر اوقات کی پابندی کرتے ہوئے واپس آجاتی ہے۔

میقات ہر میقات کے اختتام پر ڈرامے اسٹیج کیے جاتے ہیں یہ ڈرامے بنگالی یا انگریزی ہوتے ہیں۔

رسالہ جات اسکول کے مختلف شعبوں سے مختلف رسالے شایع ہوتے رہتے ہیں جن میں کہانیاں نفیس طلباء کے لکھے ہوئے مضامین اور تصاویر وغیرہ شایع ہوتی ہیں۔

سالانہ جلسے اسکول کے بند ہونے سے قبل ایک اختتامی جلسہ کر کے تمام طلباء کی شرکت سے اس کو کامیاب بنایا جاتا ہے اور ان تصاویر کی نمائش کی جاتی ہے جو دورانِ سال میں تیار کی گئیں صدر جلسہ یا خود شاعر نقائص و محاسن پر تنقید کرتے ہوئے سال رواں کی ترقیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انعامی مقابلہ رکھا جاکر بہترین تصویر اور بہترین مضمون پر انعام دیا جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر قدیم طلبا بھی مدعو کیے جاتے

ہیں اور قدیم و جدید طلباء میں فٹبال کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔

آبادی یہاں تین سو سے زائد طلباء تعلیم پاتے ہیں جن میں سے اکثر بنگالی اور بعض دیگر ممالک کے بھی طلباء ہیں، شہر سے دور شانتی نکیتن خود ایک نوآبادی ہے جہاں ایک ہزار سے زیادہ افراد رہتے ہیں۔

شعبہ جات شانتی نکیتن کو ہم مختلف شعبہ جات میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) اسکول۔ جہاں چھ سال کی عمر کے طلباء سے داخلہ شروع کیا جاتا ہے تعلیم میٹرک تک دی جاتی ہے اور کلکتہ یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں ان طلبہ کو شریک کیا جاتا ہے۔ یہاں کے کامیاب شدہ طلبا کلکتہ یونیورسٹی میں داخل کیے جاتے ہیں۔

(۲) کالج۔ جہاں میٹرک کی کامیابی کے بعد تقریباً ہر مضمون کی تعلیم دی جاتی ہے نصاب کلکتہ یونیورسٹی کے مطابق ہے اور اس کا الحاق بھی کلکتہ یونیورسٹی سے ہے۔

(۳) آرٹ اسکول (کلا بھون)۔

(۴) میوزک اسکول (سنگیت بھون)۔

ان دونوں اسکولوں کی وجہ سے شانتی نکیتن بہت مشہور ہوگیا ہے اور قدیم ہندوستانی فنِ موسیقی از سرِ نو زندہ ہوگیا ہے اس میں ہندوستان کے ہر صوبہ سے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم کی غرض سے آتی ہیں اس کے علاوہ کالج اور اسکول کی کئی لڑکیاں اور لڑکے فنونِ لطیفہ اور موسیقی سیکھنے کی غرض سے شام کے وقت شامل ہو جاتے ہیں۔

(۵) شعبہ ہائے تحقیق میں جہاں ہر زبان سے متعلق تحقیقی کام ہوتا ہے ہر ایک زبان کی لائبریری موجود ہے جیسی شعبہ تحقیق میں کوئی ڈیڑھ لاکھ کتابیں ہیں۔

شعبہ علوم اسلامیہ حضور نظام دکن کے فنڈ سے کھولا گیا ہے جنرل لائبریری میں بے شمار کتابوں کا ذخیرہ ہے اور یہ عام استعمال کے لیے کھلی رہتی ہے۔

خصوصیات اسکول کالج کی تمام لڑکیاں اور لڑکے بھائی بہن کی طرح رہتے اور باری باری کھلانے پلانے کا انتظام کرتے ہیں۔

ہر چہارشنبہ کو تعطیل منائی جاتی ہے۔

سڑکیں خوبصورت ہیں اور بجلی کا بھی انتظام ہے شب کے ساڑھے دس بجے روشنی گل کردی جاتی ہے۔

منجانب سرکار تار اور ڈاک گھر بھی کھولا گیا ہے۔

ضروریات ادارہ کے تحت پریس اور ذاتی ہسپتال کھولا گیا ہے۔
انجمن امداد باہمی کا زراعتی بنک بھی موجود ہے۔

طلباء کی وسعت نظری طلباء اپنے حاصل شدہ علوم کے نتائج سے عوام کو اور خصوصاً کسانوں کو وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے فائدہ پہنچاتے ہیں، انھوں نے آبپاشی کھیتی باڑی اور مویشیوں کی پرورش کے تمام جدید سائنٹیفک سامان مہیا کر رکھے ہیں۔

دواخانہ کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ملیریا سے متعلق یہاں ایسی عمدہ تحقیق کی گئی ہے کہ یہ موذی مرض ہمیشہ کے لیے یہاں سے مفقود ہو گیا۔

مُصطفےٰ محی الدین متعلم سال اول

سمندر کے سَاحل پر

بے پایاں دنیاؤں کے سمندر کے ساحل پر بچوں کا ملاپ ہوتا ہے!

غیر محدود آسمان سر پر ساکن ہے اور بے قرار پانی پُر شور! بے پایاں دنیاؤں کے سمندر کے ساحل پر بچے ناچتے اور قلقاریاں مارتے ہوئے ملتے ہیں!

وہ ریت کے گھروندے بناتے ہیں! اور خالی گھونگوں سے کھیلتے ہیں۔ مُرجھائے ہوئے پتوں کو جوڑ جوڑ کر کشتیاں بناتے ہیں۔ اور مُسکراتے ہوئے اُن کشتیوں کو وسیع سمندر کی سطح پر تیراتے ہیں۔ بچے دنیاؤں کے ساحل ہی پر کھیلتے ہیں! تیرتے کیونکر ہیں؟ اُن کو معلوم نہیں۔ جال کیونکر ڈالتے ہیں؟ وہ نہیں جانتے! غواص موتیوں کے لیے غوطے لگاتے ہیں۔ سوداگر اپنے جہازوں میں چلے جاتے ہیں۔ مگر بچے کنکر جمع کرتے ہیں۔ اور پھر بکھیر دیتے ہیں! وہ چھپے ہوئے خزانوں کے جویا نہیں۔ وہ نہیں جانتے جال کیونکر ڈالا جاتا ہے۔

سمندر قہقہے مارتا اور لہریں لیتا ہے۔ اور ساحل کا تبسم زردی میں چمک اٹھتا ہے۔ ہلاکت انگیز موجیں اپنے بے معنی گیت بچوں کو سناتی ہیں۔ جیسے ماں اپنے بچے کا پنگورا ہلاتی ہوئی گنگناتی ہے۔ سمندر بچوں سے کھیل رہا ہے۔ اور ساحل کا تبسم زردی سے چمک رہا ہے۔

بے پایاں دُنیاؤں کے سمندر کے ساحل پر بچوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ طوفان بے راہ آسمان میں آوارہ گھوم رہا ہے۔ جہاز بے نشان سمندر میں تباہ ہو رہے ہیں۔ موت اپنا کام کر رہی ہے۔ اور بچے کھیل رہے ہیں۔

بے پایاں دنیاؤں کے سمندری ساحل ہی پر بچوں کا سب سے بڑا میلا ہوتا ہے! (ٹیگور)

ای تاگر

یہ نظم جدید ایران کے ملک الشعراء بہارؔ نے مشرق کے شاعرِ اعظم ٹیگور کے اعترافِ کمال کے طور پر لکھی تھی۔ بہارؔ آج کل کے ایرانی شاعروں میں سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے:—

دستِ خدائی احد لم یزل — ساخت یکی چنگ بروز ازل
یافتہ ابریشمش از زلفِ حور — بستہ براو پردۂ موزوں زنور
نغمۂ او رہبرِ آوارگان — مویۂ او چارۂ بیچارگان
گفت گر این چنگ نوازید راست — مہر فزونی کند و ظلم کاست
نغمۂ این چنگ نوائی خداست — ہرکہ دہد گوش برائی خداست
گر بنوازد کسی این چنگ را — کم نکند پردہ و آہنگ را
ہرکہ دہد گوش ، وہیا شود — بند غرور از دلِ او وا شود
گرچہ بود چنگ برآہنگِ جنگ — چنگ خدا محو کند نام جنگ
چونکہ چنین چنگ خدا ساز کرد — چنگ زنی بہرِ وی آواز کرد
گفت کہ من صنعتِ خود ساختم — سوئی گروہِ بشر انداختم
کیست کہ این ساز بسازد کنون — بہرِ بشر چنگ نوازد کنون
چنگ ز من پردہ ز من رہ ز من — کیست نوازندہ در این انجمن
ہر کہ نوازد بنوازم ورا — در دو جہان سر بفرازم ورا
چنگ محبّت چہ بود جودِ من — نیست جز این مسئلہ مقصودِ من
چنگ خدا گشت میان جہان — ملعبہ و دستِ خوش گمرہان
ہرکسی از روئی ہوس چنگ زد — ہرچہ دلش خواست برآہنگ زد
در رہِ دین تیزترین زخمہ خاست — لیکن ازین زخمہ نہ آن نغمہ خاست

نغمهٔ یزدان دگر و دین دگر زخمه دگر، آن دگر و این دگر
دین همه سرمایهٔ کشتار گشت آمد و بر دوش بشر بار گشت
هرکه بدان چنگ روان چنگ داشت زیر لبی زمزمهٔ جنگ داشت
کینه برون از دل مردم نشد کبر و تفرعن ز جهان کم نشد
اشک روان گشت بجای سرور سوگ بپا گشت بهنگام سور
مهرپرستی ز جهان رخت بست سم خر و گاو بجایش نشست
گشت ازین زمزمه‌های دروغ مهر فلک بی اثر و بی فروغ
زانکه بچنگ ازلیت به فن راه خطا زد دستهٔ هر انجمن
چنگ نکو بود ولی بد زدند چنگ خدا بهر دل خود زدند
چنگ نزد بر دل کس چنگشان قلب نه رقصید بر آهنگشان
تا که دریں عصر و زمان بیدرنگ در بر «تاگر» بنهادند چنگ
ذات قدیمی پی بست و گشاد چنگ خود اندر کف اهلش نهاد
چونکه بزد چنگ بر آهنگ راست نغمهٔ اصلی ز دل چنگ خاست
نالهٔ عشاق برآمد ز چنگ پر شد از او هند و عراق و فرنگ
جمله نواها ز جهان رخت بست نغمهٔ عشاق بجایش نشست
ای تاگر این چنگ که در دست تست بود بچنگ دگران از نخست
هیچکس آن چنگ نزد بر طریق هر کسی آن زد که پسندد فریق
لیک تو خوش ساختی این چنگ را یافتی آن ایزدی آهنگ را
هرچه زنی در ره او می زنی خوش بزن این ره که نکو میزنی
طبع تو چنگ است و خرد زخمه‌اش شعر بلندت ازلی نغمه‌اش
سال تو هفتاد و خیالت نو است زانکه ز یزدان بدلت پرتو است
هرکه ز یزدان بدلش نور تافت در دو جهان دولت جاوید یافت

ای قلمت هدیهٔ پروردگار
هدیهٔ ایران بپذیر از «بهار»

شاہجہاں

خداوندِ ملک، شاہجہاں!
تجھے معلوم تھا کہ زمانہ کا تیز دھارا بہا جارہا ہے
حسن، زندگی، عزت و آبرو اور دولت سبھی کچھ
بہائے لئے جارہا ہے!
لیکن تیرے دل کا درد؟
آہ! شہنشاہ! تیری یہ آرزو تھی کہ تیرے دل کا
درد ہمیشہ کے لئے باقی رہ جائے!
تیری سلطنت جو کہ اپنے استحکام میں آسمان
سے گرنے والے برقی فولاد سے بھی محکم تر تھی،
اگر وہ سلطنت غروبِ آفتاب کے رنگین
منظر کی طرح فراموشی کے خوابِ گراں کی تاریکی سے
مل کر بجھ جاتی ہے تو جائے،
مگر، شہنشاہ! تیری یہ تمنا تھی کہ تیرے دل کا
درد، سدا ایک بلند شعلہ نورفشاں کی طرح آسمان
کو اپنے درد سے سوزاں و منور رکھے!
تیری یہی ایک آرزو تھی!
تیرا جاہ و جلال، تیری عظیم الشان سلطنت
کی شوکت، جو اس دنیا کے آسمان پر ایک محیرالعقول
لعل و زمرد و عقیق و الماس سے مرصع ایک
قوسِ قزح کی طرح چھائی ہوئی تھی!
اگر وہ شان و شوکت عدم کی ویرانیوں
میں کھو کر فنا ہو جاتی ہے تو ہو جائے۔
آہ! وہ جائے۔
زمانہ کے رخسار پر تیری آنکھ سے گرنیوالا
ایک آنسو۔ مجلاّ و مطہر۔ تاج محل!
ہائے انسان کے بے اختیار دل!
بار بار کسی کو گردن پھرا پھرا کر دیکھنے کی
فرصت کہاں ہے؟
وقت جو نہیں، زندگی کے تیز دھارے میں
تو بے اختیار بہا جارہا ہے!
اس دنیا کی مختلف منزلوں پر سے تیرا گذر
ہوتا ہے!
ایک گھاٹ پر سے تو بوجھ اٹھاتا ہے،
دوسرے گھاٹ پر جا اتار دیتا ہے۔
دکھن سے جب بادِ بہار گنگناتی ہوئی آتی ہے
تیرے باغ کے گوشہ گوشہ میں آکر جھومتی ہے

بھرتی ہے، گاتی ہے!
بہار جب تیرے لگائے ہوئے باغ میں
پھولوں کے ایک سیلاب کی طرح آتی ہے،
اور پھر جب شام کے وقت چرواہا اپنے
گلے ریوڑ گاؤں کو ہانکتا ہوا لاتا ہے،
تب مویشیوں کے پاؤں سے اُڑتی ہوئی
دھول شام کی تاریکی سے مل جاتی ہے۔
تب دیکھ! بہار کی تمام حُسن آفرینیاں بھی
آہستہ آہستہ خاک میں ملنا شروع ہو جاتی ہیں،
پھول مرجھا کر جھڑ جھڑ جاتے ہیں!
وقت نہیں، زمانہ کی ڈھیل نہیں!
پھر شبنم سے شرابور رات کا وقت ہو،
تیرے باغ میں بہار اپنے جوبن میں کمال
کو پہنچی ہو، اور پھر جب بادلوں کے ٹکڑے سفید
سفید روئی کے گالوں کی طرح نیلے آسمان میں
بھٹکتے پھریں،
تب شاید تو نے بھی آنسوؤں سے دامن
بھر بھر کر کسی کے مزار پر اپنی نذر کے موتی نثار
کئے ہوں!
ہائے اے انسان کے بے اختیار دل!
ہائے تیرا انتخاب!
سب کچھ دن تمام ہوئے پر یہیں راستہ
ہی کے کنارے چھوڑ کر چل دینا ہوگا!
وقت نہیں، فرصت نہیں، زمانہ کی مہلت
نہیں!

خداوند ملک!
جبھی تو نے اپنے تڑپتے ہوئے دل میں
سوچا تھا، اور تو نے یہ آرزو کی تھی کہ زمانے
کے دل کو حسن کا نذرانہ دیکر موہ لے، اُسے
چھین لے!
واہ! تو نے اپنی اس نذر اس تحفہ کو کیا
ہی دلفریب بنایا۔
موت، جو کہ شکل وصوت سے مبرا تھی،
تو نے اُسے لازوال حُسن مجسم عطا کیا!
واہ! تو نے اسے کیا ہی دلکش بنایا!
لیکن آہ! آنسو بہانے کے لئے زمانہ میں
فرصت نہیں، اشک ریزی کی مہلت نہیں!
جبھی تو نے اپنے نہ تھمنے والے آنسوؤں
کو سکوت مرمرین کے جال میں پھانس کر رکھدیا!
اس آسمان تلے،
چاندنی کی خاموش عبادت گاہ میں، تو
اپنی محبوبہ کو جس نام سے آہستہ آہستہ اپنے
دل ہی دل میں یاد کیا کرتا تھا،
وہ نام اور اُس کی تان آج ہر کسی کے کان
میں رہی ہے!
اے شہنشاہ! اے شاعر! وہی تیرے
دل کی آرزو کی تصویر، کسی کے حُسن دلاویز کی یاد
اس عظیم الشان،
سراپا اطمینان،
مجسمہ مرمرین میں باقی رہ گئی ہے!

یہی تیرا پیغامبر،
یہ بے مثل شعر،
یہ بے نظیر وزن، لاجواب ترنم،
آسمان کی طرف سدا پرواز کر رہا ہے،
جہاں تیری محبوبہ کی آرام گاہ ہے!
وہ صبح کے منظر رنگین کے انعکاس میں ہرا
شام کی تھکی ماندی گہری سانس میں ہے
جو افق مغرب پہ چھائی ہوئی ہے!
پورے چاند کی چاندنی کے کھیت میں
چھٹکنے والے موتیا کی ملاحت بے پایاں میں ہے!
وہ اس غیر مرئی ناقابل بیان فردوس میں ہے،
جہاں سے تشنۂ دیدار آنکھیں بار بار نامراد لوٹ
آتی ہیں!
تیرا یہ بے زبان پیغامبر، حسن کا پتلا، تاج محل،
ہر زمانہ میں زمانہ کے پہرہ دار کی نگاہ بچا کر، تیرا
پیغام لے کر چلا جاتا ہے!
"بھولا نہیں، میری جان میں تجھے بھولا نہیں"!
شہنشاہ! آج تو اس دنیا میں نہیں!
تیری سلطنت ایک خواب شیریں کی طرح اڑ گئی!
تیرا تخت آج باقی نہیں!
تیرا لشکر، جس کے قدموں کی دھمک سے
زمین کے توازن میں خلل آجاتا تھا، دنیا ڈانواڈول
ہو جاتی تھی،
آج اس تمام جاہ و جلال کی یاد دہلی کی سڑکوں
کے گرد و غبار میں اڑتی پھرتی ہے!

تیرے درباری مصاحب، تیری بارگاہ کے
شاعر آج تیری مدح میں قصیدہ خواں نہیں!
جمنا کی لہروں کی تال سے تیرے محل کی
نوبت کی تال نہیں ملتی!
محل کی حسین رقاصہ کے پازیب کی جھنکار
ویران محلوں کے گوشوں میں خاموش پڑی ہے!
اور آج وہاں جھینگروں کی کرخت آواز کی
گونج سُنکر، اندھیری رات کا تاریک آسمان اپنی
قسمت پر پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے!
تیرا قاصد، جسے تکان کبھی اپنی خدمت سے
برگشتہ دل نہیں کرتی۔
بادشاہوں کی سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے
سے جسے سروکار نہیں۔
جو زمانہ کی تعمیر و تخریب کو کسی گمان میں نہیں لاتا۔
زندگی اور موت کی دستبرد سے جو آزاد ہے،
اپنے نغمۂ دل گداز سے عالم کو محو غم کئے ہوئے
ہے، تیرے اس قاصد کا پیغام۔ تاج محل کی فریاد،
سدا کے فراق زدہ شہنشاہ کا پیغام ہے:
"بھولا نہیں، میری جان میں تجھے بھولا نہیں!"
غلط ہے، کون کہتا ہے تم بھولے نہیں؟
کس نے کہا کہ محبوبہ کی یاد کے قفس کو
کھول کر تو نے یاد کے پرندے کو اُڑ جانے نہیں دیا؟
تو نے محبوبہ کی یاد کے پرندے کو اُڑ جانے
نہیں دیا؟
ماضی کا افق مغرب جو سدا ایک عالم تاریک

وتار ہے، تیرا دل آج بھی اُس کی زلفِ سیاہ کے
پیچ میں اٹکا ہے؟
فراموشی کی سدا کھلی راہ پر وہ نکل نہیں گیا؟
مزار، مزار تو سدا ایک جگہ پر قائم ہے!
تربت کی گہری تاریکیوں میں چھپا ہے!
اور تربت موت کو اپنے کفن کے پردہ میں
ڈھانپ کر رکھتی ہے!
لیکن زندگی؟ زندگی کو کون روک سکتا ہے؟
کون ٹھہرا سکتا ہے؟
آسمان کا ہر ستارہ اُسے اپنی راہ پر بلا رہا ہے:
چلے آؤ! عالم عالم میں زندگی کو دعوت ہے!'
زندگی کے ہر نئے مطلع صبح میں اُسے بلاوا ہے!
یاد کی گرہ ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے، وہ ہاتھ
سے چھوٹ چھوٹ جاتی ہے، فراموشی کی کھلی
راہ میں کھو جاتی ہے!
شہنشاہ! تجھے دنیا کا تاج و تخت اپنی آغوش
میں سنبھال کر نہیں رکھ سکا،
سمندروں کی پرورش کی ہوئی یہ زمین،
اے عظیم الشان! تیری زندگی کے لئے ناکافی ثابت ہوئی'
جبھی تو اس دنیا کو زندگی کی رنگین محفل سے
برخاست ہوتے وقت دونوں پاؤں سے ٹھکرا کر
چل دیا!
تو خود اپنے اعمال کی بزرگی سے کہیں بزرگ تر
ہے، جبھی تیری زندگی کا رخشِ تیز گام بار بار تیرے اعمال
اور اُنکے نتائج کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے!

جبھی تیرا نشان یہاں باقی رہتا ہے اور تو خود
یہاں نہیں رہتا!
وہ دلبستگی جو آگے بڑھ نہ سکے نہ بڑھا سکے،
جس عشق نے اپنا تخت سرِ راہ رکھدیا ہو،
اُس عشق نے جس لطف اور عشرت سے تیرا استقبال
کیا، وہ راستہ کی دھول کی طرح تیرے پاؤں سے
لپٹا رہ گیا تھا، تو نے اُسے اپنے پاؤں کی گرد کی طرح
جھاڑ کر راستہ کے حوالہ کیا!
مگر تیرے پیچھے کی راہ کی گرد میں، تیرے دل کا
ٹکڑا نہ معلوم کب گرا تھا، وہ گویا تیری زندگی کی مالا
کا ایک بیج تھا، جو کھل کر گر پڑا!
تو خود تو بہت دور جا چکا ہے، لیکن وہ
بیج ایک لازوال پھول کی صورت میں کھلا ہے!
آسمان کی طرف منہ اُٹھائے کھڑا ہے!
اس کے نغمہ کی تان پکارتی ہے:
"جس قدر دور بھی نگاہ ڈالتی ہوں، وہ مسافر
خود تو کہیں نہیں!
اسکی محبوبہ اُسے روک نہ سکی، تخت و تاج نے
اُس کے لئے راستہ چھوڑ دیا، اُسکی راہ میں حائل نہ ہوا'
کوہسار اور قلزم آگے سے ہٹ گئے،
آج اُس کا راہوار، شبِ تار کی خاموش گونج
میں سے، ستاروں کی تان پر اُڑتا ہوا مطلع صبح
کی طرف رُخ کئے چلا جا رہا ہے!
جبھی میں آج یہاں محبوبہ کی یاد کے بوجھ تلے پڑی
ہوں، اور وہ جو اس بار سے آزاد ہے یہاں نہیں!"

ٹیگور

اے میرے بدنصیب وطن

جنھیں تو نے بے عزت و بے آبرو کیا ہے،
انکی ذلت میں ذلیل ہوکر تجھے انھی کے برابر ہونا پڑیگا!
جن کی انسانیت کے حق کو تو نے چھین لیا ہے،
اپنے روبرو کھڑا رکھکر جنھیں تو نے اپنے قریب
بیٹھنے کی جگہ تک نہ دی،
انکی بے آبروئی میں تجھے بے آبرو ہونا پڑے گا!
تو نے نفرت سے انسان کے جسم کو اپنے جسم سے
چھونے نہ دیا، انسان کو تو نے اپنے پاس سے دھتکار دیا۔
انسانیت کے پروردگار کو تو نے آئے دن اپنی نخوت
سے ٹھکرا کر ذلیل کیا، قہر اور قحط و وبال کے عالم میں
تجھے بھی ان کا شریک ہونا پڑیگا!
تجھے بے آبروئی میں انکے ساتھ بے آبرو ہونا پڑیگا!
اپنی بلند مسند پر سے جب تو نے انھیں دھتکار دیا،
تو ظالم تو نے اپنی قوت بازو کو ذلیل کر کے اپنے گھر سے
نکال دیا۔

وہ قوت پاؤں میں پامال ہوتی ہے،
اسکی زندگی سڑک کی دھول میں کٹتی ہے!
اس پستی میں، قعر مذلت میں اتر آ!
کود پڑ — تیری سلامتی کی اور کوئی راہ نہیں!
ذلت و بے آبروئی میں تجھے سب کا شریک ہونا پڑیگا!
تو نے جنھیں نیچے گرا دیا ہے وہ تجھے بھی اپنی
پستی میں لے مریں گے!
تو نے جنھیں پیچھے پھینکدیا ہے وہ تجھے بھی پیچھے کھینچیں گے!
جہل کی تاریکی میں تو نے انھیں ڈھانپ رکھا ہے،
تیرے نصیبوں پر بھی اسی تاریکی کا سیاہ پردہ پڑا ہے!
ہاں بے آبروئی میں تجھے بھی سب کا شریک ہونا پڑیگا!
سینکڑوں صدیوں کی ذلت و بے آبروئی کے
بار گراں کے سبب انسان اپنا سر اوپر اٹھا نہیں سکا!
تجھے شرم نہیں آئی، تو نے دیکھا نہیں؟
بے کسوں کا معبود انکے ساتھ گرد و غبار میں آ گیا!
موت کا پیغامبر تیرے دروازہ پر کھڑا ہے!
تو نے اسے بھی دیکھا نہیں؟
اگر تو سب کے ساتھ نہ مل سکے تو الگ ہو جا!
اپنی خودی اور رعونت میں پابزنجیر دور کھڑا رہ
کہ موت کی قلب سوز آگ کے شعلوں میں جل بھن کر
راکھ ہوکر، تجھے سب کے ساتھ مل کر ایک ہو جانا ہوگا!

(ٹیگور)

ٹیگور ۔ اسّی سال کی عمر میں

مترجمہ

جناب مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی بی ۔ اے

چار سال کی بات ہے، میں نے اَترائی ندی پر کشتی میں شاعر سے ملاقات کی۔ وہ تیتی سار سے آرہے تھے اور اسٹیشن جا رہے تھے۔ میں بھی ان کا ہم سفر تھا۔ ہم اسٹیشن پہنچ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ گاڑی آئی اور ہمیں ایک ہی ڈبے میں جگہ مل گئی۔ میں نے کبھی رابندر ناتھ ٹیگور کو اس حالت میں نہ دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر میں نے ایک نیا حُسن دیکھا۔ یہی کیفیت گذشتہ سال میں نے شانتی نکیتن میں بھی دیکھی۔ یہ وہی حُسن ہے جو کسی حُسن کار کے صفحۂ حیات پر کارفرما نظر آتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب کہ وہ تمام دنیاوی خواہشات سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور یہ چیز ضعیفی کے کامل سکون کے ساتھ شاعر کی زندگی کی شریک بن گئی تھی۔ ختم شدہ جذبات کا خزانی سکون اس کے چہرے پر لہراتا نظر آتا تھا اور اس کا اظہار اس کے ان مقدس بالوں سے ہو رہا تھا جو خزاں رسیدہ خشک گھاس کی طرح اس کے باوقار چہرے پر رقصاں نظر آرہے تھے۔ اس سے پہلے میں نے ٹیگور سے کبھی اس عقیدت و محبت کا اظہار نہ کیا تھا۔ وہ مجھے کبھی اتنا حسین معلوم ہی نہیں ہوا۔ شاید اس کو یہ طویل زندگی دراصل اس تقدس اور حُسن کے اظہار کے لیے عطا کی گئی تھی۔ اگر زندگی بجائے خود، خود اظہاری ہے تو اس کو ابھی اور زندہ رہنا چاہیے تھا۔

جوں جوں وہ موت سے قریب ہوتا گیا اس سے موت کا خوف دُور ہوتا گیا۔ اس کے آخری دَور کی شاعری اس بیان کی شاہد ہے۔ اگرچہ وہ جسمانی کمزوری محسوس کرتا تھا لیکن اس کی شاعری اس کو فرحت و انبساط کے اسباب مہیا کردیتی۔ وہ نہایت بے باکانہ طور پر دنیوی تفکرات سے مستغنی اپنے اشعار پر جھومتا تھا۔ گویا زندگی کی دوامی مسرت اس نے اپنی شاعری سے حاصل کی تھی۔ یہ کیفیتیں ہم پر بھی گذرتی ہیں۔ مثلاً ہم

کہیں جانے کے لیے سواری کے انتظار میں تیار بیٹھے ہیں۔ ساتھ رہنے کا سامان باندھ لیا جاتا ہے اور چھوڑ جانے کا ایک جگہ مناسب انتظام کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ اس وقت دل پر کسی قسم کی داخلی یا خارجی گھبراہٹ نہیں ہوتی کسی بے کار پڑی ہوئی چیز کا خیال بھی نہیں ستاتا اور نہ کسی نا تکمیل کام کا اس وقت افسوس ہی ہوتا ہے لیکن اس کے برخلاف ایک دو دن تاخیر سے نکلنے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی بلکہ اس کی جگہ افسردگی اور پژمردگی لے لیتی ہے۔ اس وقت ہم بنی نوع انسان سے محبت کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ساری مخلوق ہمیں چاہتی ہے اور اس وقت ہم اس خیالی رشتۂ اخوت کو توڑنے کے روادار نہیں ہوتے۔

یہی حال شاعر کا ہے۔ وہ چلے جانے کا اتنا متمنی نہیں وہ زندگی میں ایک حجاب سا محسوس کرتا ہے۔ وہ حسین تمنائیں جس کو اس نے انسانیت کی خاطر عزیز سمجھا، ان کو مرجھاتا ہوا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ ان گہرائیوں پر نظر دوڑاتا ہے جہاں انسانیت ہچکیاں لے رہی ہے۔ جرمنی جس کا وہ مداح رہا آج کس رنگ میں ہے۔ جاپان جس کی جرمنی سے زیادہ شاعر نے وقعت کی کس حال میں ہے۔ اور انگلستان — وہ انگلستان جس کی شاعر نے بچپن سے عزت کی اور سراہا، وہ انگلستان جس کی تو قیر و قدر نے شاعر کو اس کی عمر کے درمیانی حصے میں ہی ایک بلند رتبے پر پہنچا دیا، آج کہاں ہے۔ وہ زندہ رہا تاکہ ان مہذب اقوام کی تہذیب کا زوال دیکھے اور اس پر اپنی آنکھوں سے موتی لٹائے۔ اس کا بد قسمت ملک۔ اس کا اپنے ملک سے تعلق حد درجہ الم ناک ہے۔ کوئی چیز یہاں قابل فخر نہیں اور درد و کرب کی زندگی کے سوا ہندوستان میں کچھ نہیں۔ ان تمام چیزوں کے باوجود وہ ہندوستان پر بھروسا رکھتا تھا اور گاندھی جی پر اعتقاد۔

تمام ملکوں کے نوجوان اور نو وارد اس کی دعاؤں سے فیض یاب ہوتے۔ وہ دنیا کے لازوال شباب پر اعتقاد راسخ رکھتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ کیا اب بھی آپ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں تو مجھے اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا، لیکن وہ فطرت کی شوخیوں اور انسان کے اعمال حسنہ کا جن پر زمانے نے مہر دوام ثبت کر دی ہے، معتقد تھا۔

اس کی زندگی کی شام ابر آلود رہی۔ لیکن وہ ایک ایسا ستارہ تھا جو بغیر کسی مزاحمت کے تابانی کے ساتھ درخشاں رہا۔ گوئٹے اور ٹالسٹائی کی طرح اس کا بھی آخری زمانہ گوناگوں مصروفیات میں بسر ہوا۔ نوجوان ادیبوں کو اس کا اعتراف ہے کہ اس نے آخر وقت تک بھی اپنی روزانہ کی ضخیم تازہ تحریروں سے ان کو شرمندہ کیا۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ وہ مصور بھی تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے پوچھا، کیا تم نے کبھی کوئی تصویر اتاری ہے؟ میرے جواب نے شاعر کو مایوس کر دیا۔ گویا کہ اس سے زیادہ خوشی اور فرحت کوئی اور دوسری چیز انسان کو نہیں دے سکتی اور ہر وہ شخص جو تصویر

اُتارنا چاہتا ہے اُتار سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ مصوری کا سامان اپنے ساتھ رکھتا۔ شاعر نے کہا تھا کہ وہ اپنے خیالات ایک تصویر میں اپنی تحریروں سے زیادہ واضح اور بہتر طریقے پر ظاہر کر سکتا ہے، وہ اس فن کا اتنا دل دادہ تھا جیسے کوئی مُسن شوہر اپنی کم سن بیوی کا۔ اگر مدیرانِ رسایل اس کو لکھنے کے لیے مجبور نہ کرتے تو وہ مصوری کو اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے انتخاب کرتا، بصارت کی کمزوری کے باوجود اس کا برش صفحہ قرطاس پر نہایت پھرتی سے کام کرتا۔ اس کی مصوری اس کی ادبیات سے زیادہ قیمتی ہے، کیونکہ اس کی روح تصویروں میں زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ اگر وہ لکھتا تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر لکھتا اور یہ محسوس ہوتا کہ وہ بے ذوقی سے لکھ رہا ہے، لیکن اس کی مصوری اس کے برعکس ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اظہار خیال کے ان مختلف ذرایع سے جو اس کو حاصل تھے وہ برابر کام لیتا رہا اس نے بہت سے گیت بھی بنائے ہیں لیکن اس کی مصوری سے زیادہ جھلکیاں اس کے گیتوں میں بھی نہیں ملتیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے وہ نثر سے زیادہ نغمے لکھنے میں مصروف دیکھا گیا، اس میں شک نہیں کہ شاعری اس کی زندگی بھر کی رفیق رہی ہے، لیکن وہ بھی اس کی مصوری کی طرح نہایت لطیف ہے۔ اس نے جتنی بھی مقفیٰ نظمیں لکھی ہیں وہ بھی گویا دوسرے رنگ کی تصویریں ہیں۔ زندگی کے اس دَور میں وہ اپنی نظموں سے ترنم کی خاطر اور نظموں سے نظم کی خاطر مسرت حاصل کرتا ہے۔ اس کی یہ ادبی پیداوار نہ بےمعنی ہوتی ہے اور نہ ناقابل فہم۔ اس کی تصویروں میں جو چیز آنکھوں میں کھبی جاتی اور دل کو متاثر کرتی ہے وہ قوتِ حُسن کاری ہے۔ یہ قوت اتنی شدت سے ظاہر ہوتی ہے جیسے کسی عہد ماقبل تاریخ کے انسان کی۔ اس کی مقفیٰ نظموں میں وہ اعجاز ہے جو قلوب کو متاثر کرتا ہے، ایسا مسرور و مسحور کن اعجاز جیسے ماقبل تاریخ کا انسان اپنی ہی گونج پر متحیر ہو گیا ہو۔ اس کی حُسن کاری اور شاعری دونوں اس کے وجدانی ذہانت کے اظہار ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے گویا اس نے قدیم زمانے کی ذہانت و شعور کو خود اظہاری کے لیے موجودہ دَور میں لا کھڑا کیا ہے۔ وہ لکھتا تھا تصویریں اُتارتا تھا میں نے خانگی طور پر یہ بھی سُنا ہے کہ وہ بچت و بنج کے فن سے بھی واقف تھا اور ہومیوپیتھی اور طب سے متعلق بھی مشورے دیتا۔ ان چیزوں نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا۔ میں نے یہ بھی سُنا کہ شیلڈا میں اس نے ایک نئی کھاد کی دریافت کے لیے کچھ مچھلیاں زمین میں دفن کرائیں۔ کچھ دن بعد وہ سب سڑ گئیں اور اس قدر تعفن پیدا ہو گیا کہ قرب و جوار کے لوگوں کو اپنے گھر چھوڑ دینے پڑے۔ اسی طرح جب اس کا بیٹا علم الفلاحت کی تیاری کے لیے امریکہ گیا تو وہ مطمئن نہیں ہوا، اور ایک قطعہ اراضی ساحل پر خریدنے اور اس میں کاشت کروانے کے لیے تیار ہو گیا۔ شیلڈا کے دفتر میں میں نے چند خطوط ایسے بھی پڑھے ہیں جن کا تعلق زمیں داری سے ہے، ان خطوط میں شاعر نے اپنے آپ کو ایک زمیں دار بتلایا ہے

خطوط کی تحریر میں کوئی غلطی نہیں، لیکن پھر بھی وہ ایک ادیب کی تحریر نہیں معلوم ہوتے۔ میں نے اس کے زمیں دارانہ اہتمام کی ایک مثال پتی سار میں دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ اس نے اپنے کسانوں کی فلاح وبہبود کے لیے کیا کیا۔ اس کے کسانوں نے خود مجھ سے کہا ہے کہ وہ شاعر سے محبت کرتے تھے، وہ ایسا انسان نہیں جس کی یاد دل سے محو ہوسکے۔ میں نے ایک ضعیف آدمی سے اس کے شباب کا ایک قصہ سنا ہے جو خالی از دلچسپی نہ ہوگا:۔ دیوندر ناتھ (ٹیگور کے والد) کے انتقال پر سرادھ کی رسم ادا کرتے وقت اس کے کسان حسب حیثیت مختلف تحفے لائے۔ پہلے دن تو رواج کی لاج رکھنے اور غریبوں کو آزردہ نہ دیکھنے کے لیے شاعر نے سب تحفے قبول کرلیے، لیکن دوسرے دن صبح سب واپس کر دیے، اور ان کے تعجب پر اس نے کہا کہ:۔ "یہ کتنی شرمناک چیز ہے کہ والد کی سرادھ کی رسم ادا کی جائے اور وہ تحفے قبول کرے"۔ شاعر کی یہ حرکت غیر معمولی تھی اور ہندوستان میں کسی زمیں دار نے ایسا نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ شاعر کی انھیں خوبیوں نے کسانوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ ابتدائی ندّی پر شاعر نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ جب کسان شاعر کے سامنے آئے تو انھوں نے کہا چونکہ وہ اتنے خوش قسمت نہ تھے کہ پیغمبر کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کرتے اس لیے وہ اس کو دیکھنے تھے۔ اس سے بھی شاعر کے تقدس اس کی ہر دلعزیزی اور عظمت کا ثبوت ملتا ہے۔

اگر شاعر کی ان تھک محنت اسے گوئٹے اور ٹالسٹائی کا ہمسر بناتی ہے تو پھر بھی ایک بنیادی فرق باقی رہ جاتا ہے کہ وہ لوگ اپنی ادبیات میں ندی کی طغیانی کی طرح ترقی کرجاتے ہیں اور بہتے چلے جاتے ہیں، لیکن شاعر کی ترقی طائر کی پرواز سے مشابہ ہے، وہ فضا میں انتہائی بلندیوں پر اڑتا ہے اور پھر اپنے آشیانے پر واپس آجاتا ہے۔

شاعر کا سادھنا بار بار اپنے سرچشمے کی طرف لوٹتا ہے۔ اس کے قلب کی گہرائیوں میں ایک مقام ہے جہاں وہ استراحت کرتا ہے۔ وہ یہاں تازہ دم ہوتا ہے اور پھر بلند پروازی اور فلک پیمائی میں مصروف ہوجاتا ہے، اور ہر پرواز پر اپنے آشیانے کو ان بلندیوں سے بھی تاکتا رہتا ہے۔ آیندہ نسلیں اس کی ابتدا اور انتہا اور طلوع وغروب میں استقامت اور استواری پائیں گی اور اس کے کسی ہمعصر میں یہ استقلال و ثبات نظر نہ آئے گا۔

ایک لحاظ سے اس کی یہ ایک حد بندی ہے جس طائر کی نظر آشیانے پر ہوگی عشق مقام اس کی پرواز میں مانع ہوگا، اور ہر رات اس کو اپنے آشیانے پر آنا لازمی ہے۔ شاعر کی زندگی معمور اور کامیاب ہے۔ اس کی پرواز کے لیے حد کا کوئی تعین نہیں۔ وہ اس قید سے آزاد ہے۔ اگر اس کے

فلسفۂ حیات کا ایک بند بار بار دُہرایا جاتا ہے تو یہ قصور شاعر کا نہیں، بلکہ اس کے مُلک کا ہے جو اس کو ایک ہی بات کے دُہراتے رہنے پر مجبور کرتا۔ بہ قول جوش ؎

جاہلوں کی ہے یہ بستی، کون سُنتا ہے یہاں　　کب تلک چیخا کروں ہندوستاں ہندوستاں

یہ غلط نہیں ہے کہ ہمارے بال و پر کی وسعت جسمانی اور ذہنی طور پر محدود ہو جاتی ہے۔ ہم کبھی آگے دوڑتے ہیں اور کبھی پیچھے، لیکن نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ مستقل ترقی میں بھی چند ایسے موانعات پیش آتے ہیں جن سے کوئی سُکون نہیں ملتا۔ گوئٹے اور ٹالسٹائی کا آخری عہد تشفی بخش اور سُکون پرور نہ تھا۔ ہار جیت۔ کش مکش۔ شک و شبہہ اور مختلف مسایل اور افکارات انھیں گھیرے رہتے تھے۔ اگر یہ اندرونی اختلافات شاعر میں ہوتے تو وہ ان پر قابو پاتا۔ ہمیں اس کی اس تعلیم کا ممنون ہونا چاہیے جو اس نے اپنے والد اور ان سے زیادہ فطرت سے حاصل کی۔ وہ اس حالت میں نہایت خاطر جمع رہتا جب کہ بیرونی منافشات اس کو پریشان کرتے ہیں۔ شاعر کو دنیا مظالم، ناانصافیوں اور دُکھ بھری داستان سے معمور دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی بنا پر وہ پرداشتہ خاطر نہیں ہوتا، کیوں کہ یہ طائر اپنے آشیانے کا تصور کبھی نہیں بھولتا، اور یہی وہ چیز ہے جس نے شاعر کی قوتِ تخیل کو رفعت و قوت بخشی اور اس کے قدموں کو ڈگمگانے سے بچایا۔ اس کی استقامت کا یہ عالم رہا کہ نہ تو کبھی اس کی گفتگو بے ربط رہی اور نہ تلفظ میں انتشار پیدا ہوا۔ وہ جو کچھ کہتا نہایت بہتر طریقے پر کہتا۔ وہ آخر تک تشبیہ اور استعاروں سے کھیلتا رہا۔ ظرافت اس کے خمیر میں تھی۔ بہ ظاہر اس کا جسم کمزور تھا اور اس کی صحت دن بہ دن بیٹھ رہی تھی، لیکن اس کے ذہن میں کسی قسم کا انحطاط نہیں پیدا ہوا تھا۔ حافظہ قدرے کمزور ہو گیا تھا، لیکن اس کا تخیل پہلے کی طرح بلند، ذہانت نفاست پسند۔ شایستگی معصوم اور نرم دلی ہمیشہ متحرک رہی ہے۔ وقت کے سیلاب نے اس کے قوائے ذہنی کو متاثر نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ فرزانہ و ہوش مند رہا۔ اس کی اسی داخلی زرہ (اپنے آشیانے پر نظر) نے اس کو کُہن سالی کی نازیبا حرکتوں سے بچالیا۔

وہ بہت مصروف انسان تھا۔ ایک اپنیشد میں لکھا ہے :۔ "کام کرنے کے لیے انسان کو سو سال بھی زندہ رہنا چاہیے۔" وہ اسّی سال کی عمر تک بھی اسی عقیدے اور ویدانتی فلسفے پر کاربند رہا۔

اتنا کام کرنے کے باوجود بھی وہ اپنے لیے فرصت کے اوقات نکال لیتا۔ میں جب کبھی اس کے پاس گیا، اس کو بے کار پایا، اور میں سمجھتا رہا کہ فالتو وقت کی اس کے پاس کمی نہیں۔ وہ مجھ سے اس طرح گفتگو کرتا گویا وقت اس کی اختیاری چیز ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد نقشہ بدل جاتا، اور دوسرے لمحے میں یہ معلوم ہوتا کہ شاعر بالکل عدیم الفرصت ہے۔ وہ لگاتار کام کرتا، اور کچھ وقت آرام و آسایش کے لیے نکال لیتا۔

لیکن اس وجہ سے اس کے کام میں عجلت یا بدحواسی نہ ہوتی۔ میں اس کی بے کاری کے وقت کا سرچشمہ پانے میں ناکام رہا ہوں۔ ایک شخص جب بالکل آزادی سے آزاد فضا میں سانس لیتا ہو تو اس کے لیے کام کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ وہ کام کیے جاتا ہے لیکن ایک مشغلے کے طور پر۔ روحانی طور پر نہ سہی، دنیاوی حیثیت سے رابندر ناتھ ایک آزاد انسان تھا، بالکل آزاد، بے فکر اور وقت کی قید سے بے نیاز۔

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جوں جوں انسان بوڑھا ہوتا ہے اس کی گفتگو میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، لیکن ٹیگور کی حالت اس کے برعکس تھی، چونکہ اس کی روح کو کسی سے انفراداً تعلق نہ تھا، اس لیے وہ حسد سے بے نیاز رہا۔ وہ ہر موضوع پر، حتیٰ کہ آزاد جنسی تعلقات پر بھی گفتگو کر سکتا تھا جس کا ثبوت ان کا وہ افسانہ ہے جو "دی لیبوریٹری" میں شایع ہوا موجودہ دور کے ادیبوں میں کوئی ادیب اس سے زیادہ جدید العصر اور جری نہیں۔ اس کے فنون لطیفہ کی استعداد ایسی ہے کہ ذہن میں کسی ناقص چیز کا گذر ہونے نہیں دیتی، اور رابندر ناتھ کی اسی ذرہ نے یہاں بھی اس کو بچا لیا ہے۔ وہ ہمیشہ اتنا غیر جانب دار نہیں رہا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ اس کی اس نفاست کو ٹھیس بھی لگی ہے۔ ذہن کی آزادی کی وجہ سے اس کی جانب داری ختم ہو چکی تھی، لیکن اپنی ذرہ سے بھی کبھی مغلوب نہیں ہوا۔ اس نے اپنے قوائے عقلیہ کو ہمیشہ آزاد رکھا، جس طرح جسم انسانی عمر کا بار برداشت کرنے کے ناقابل ہو جاتا ہے باوصف اس کے کہ وہ کافی بنا ہوا اور مضبوط ہو۔ اسی طرح ذہن بھی اپنی بندشوں کی رعایت نہیں کر سکتا، بشرطیکہ اس کا قلب کافی محصور و مضبوط ہو۔ اس طرح اپنی آزاد نظموں میں وہ قوانین سے اعراض کر سکتا ہے کیونکہ وہ قافیہ پیمائی اور ردیفی قیود پر قابو پا چکا تھا، اور اس مہارت کی بنا پر اس نے اس صنف سخن کو اپنی جولاں گاہ نہیں بنایا۔ اس کی ظاہرا آزادی کے پس منظر میں زندگی کی تنظیم ہے اس نے سزا کی برادت سے آزادی کا حق حاصل کر لیا ہے۔

اس کی زندگی کی کہانی ستو پتیوں والے کنول کے پھول سے مشابہ ہے، اور جوں جوں ایک ایک پتی کھلتی ہے ایک ایک قید سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔

رابندرانات ٹاگور

مندرجہ ذیل نظم ایران کے مشہور شاعر رشید یاسمی نے ۱۹۳۱ء میں سرگ باشی ٹیگور کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر لکھ کر "قلمرو سعدی و کشور خیام" کی طرف سے مشرق کے شاعر اعظم کا خراجِ تحسین ادا کیا تھا:—

درود باد برآں شاعرِ بلند مقام — کزو ببالد فخر و بود بناز و نام
گزیدۂ شعرا مفخر ادب ٹاگور — کہ کشور سخن از وی گرفت نظم و قوام
یگانہ مہر درخشانِ شرق کز نورش — زدودہ گشت جہانِ سخن ز زنگِ ظلام
چو آفتاب ز آفاق شرق تاباں شد — وز او گرفت ہمہ غرب روشنائی و وام
نماند گوشۂ اندر ہمہ بسیط زمین — کہ صیت فضلش ننہاد اندر آنجا گام
ز گفتہ ہائے دلاویز و نکتہ ہائے لطیف — ہمی رساند جان را از آسمان پیغام
کند پدید ز لفظ بدیع و معنی و نغز — بخاطر اندر آثار روح در اجسام
معانی اندر لفظش چو عالمِ ملکوت — کہ نیست آنجا اندیشہ از فشار و زحام
ترانہ ہائے دل انگیز او بہر روزی — ہزار خاطرِ آشفتہ را کند آرام
ہنروری کہ ز سحر کلام چیرہ شدہ است — بشرق و غرب زمین بر قلوب و بر افہام
ز رائے روشن او بہرہ می برد یکساں — زدودہ فکر خواص و جمود طبع عوام
ایا خلاصۂ ذوق و کمال و دانشِ شرق — کہ چوں تو پور نزاید ز مادرِ ایام
بہ ہیچ جائی چنان قدر تو نہ شناسند — کہ در قلمروِ سعدی و کشورِ خیام
نہ چون دگر شعرا شعرہائے دلکشِ تو — شکایت شبِ ہجر است و وصفِ جامِ مدام
کہ ہرچہ گوئی پند است و حکمت و اخلاق — ز بہرِ صلح و صفا و ز بہر امن و سلام

زدارو ی سخنت جان درد مندبشر — نجات یابد از آسیب و محنت و آلام
تراز جایزہ ہاسے نوبل کہ بگرفتی — اگر ھزار بگیری ہنوز نیست تمام
ثنا شعر تراشاید ار سپہر بلند — بیفگند مہ و خورشید و زہرہ و بہرام
بجشن ہفتاد از عمر تو بباایستی — کہ سوئے ہند از ایران بہ بستمی احرام
چو راہ دور مرا زیں طواف داد و باز — بدیں قصیدہ فرستم ترا درود و سلام
بہ پیری اند طبیعت جوان و نیرو مند — دل تو خرم و جان باد مہبط الہام
دل رشید ز آثار فکر روشن تو — بسان طبع تو شادان و خرم و پدرام

کاغذ کی ناؤ

روز روز ایک ایک کر کے میں اپنی کاغذ کی کشتیاں بہتی ہوی ندی میں تیرا تا ہوں۔ میں ان کشتیوں پر سیاہ حروف میں اپنا اور اپنے گاؤں کا نام لکھ دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ کسی دوسرے ملک میں کوئی شخص ان کو دیکھے گا اور جانے گا کہ میں کون ہوں۔

میں اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو اپنے باغ سے "شیولی" کے پھول لا لا کر بھر دیتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ صبح کے یہ پیارے پھول رات کو صحیح سلامت زمین سے جا لگیں گے۔ میں اپنی کاغذ کی کشتیاں ندی میں چلاتا ہوں۔ اور آسمان کی طرف نگاہ اُٹھاتا ہوں۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے بادل بھی اپنے سفید سفید اُبھرے ہوے بادبان کھول رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ میرا کونسا دوست آسمان میں ہے۔ جو ان بادلوں کو ہوا پر چھوڑ دیتا ہے۔ کہ وہ میری کشتیوں کے مقابلے میں دوڑیں۔

جب رات ہو جاتی ہے تو میں اپنا چہرہ اپنے بازوؤں سے چھپا لیتا ہوں۔ اور خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری کاغذ کی کشتیاں آدھی رات کے تاروں کی چھاؤں میں برابر بہتی چلی جاتی ہیں۔

نیند کی پریاں ان میں سوار ہیں۔ اور اُن کے پاس اُن کی ٹوکریاں خوابوں سے بھری ہوی رکھی ہیں۔

(ٹیگور)

اُردو زبان اور ٹیگور

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور ہندوستان کے مایہ ناز اور زندہ جاوید شاعر ہیں ۔ یقیناً آنے والی نسلیں ٹیگور کی اعلیٰ علمی و ادبی قابلیت اور بین قومی شہرت کی وجہ سے ان کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی ایک اہم ترین شخصیت کی حیثیت سے یاد رکھینگی ۔ ان کے اعلیٰ علمی و ادبی کارنامے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں جو بنگالی ادبیات عالیہ میں زرّین حروف سے لکھے جائینگے ۔ ٹیگور نے نصف صدی سے زیادہ ہندوستان کی خدمت کی ہے اور اپنے کلام سے بنگالی ادب میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا ہے ۔ چونکہ ٹیگور کی شخصیت جغرافی حدود سے بالاتر تھی اس لیے ان کی ادبیاتِ عالیہ نے دنیا کی اکثر زبانوں پر اثر ڈالا ۔ دنیا کے ہر حصے میں ان کے قدردان پیدا ہوئے جنھوں نے ان کے کلام کو دل میں جگہ دی اور شہرت دوام کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا ۔

اُردو بھی جو ہندوستان کی عام اور بنگالی کی ہمسایہ زبان ہے ٹیگور کی عالمگیر مقبولیت کے اس اثر سے نہ بچ سکی، چنانچہ اُردو پر بھی ٹیگور کا گہرا اثر ہوا ۔ ان کی بے حد و اندازہ مقبولیت اور عالمگیر شہرت کا نتیجہ تھا کہ اُردو میں شاعروں اور انشا پردازوں کی ایک ایسی جماعت نے جنم لیا جس نے ٹیگور کے رنگ میں لکھنا شروع کیا ۔ ٹیگور کے خیالات سے اثر پذیر شعرائے اُردو میں جوشؔ، امجدؔ، افسرؔ اور اخترؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ اس جدید طرزِ نگارش کا جو فوری اثر اُردو پر مترتب ہوا اس کی وجہ سے اُردو نثر اور نظم میں مادیت کا عنصر گھٹتا گیا اور اور اس کی جگہ غیر مادی عناصر نے لے لی ۔

گیتان جلی کی اشاعت سے پہلے خود بنگال بھی ٹیگور کی شخصیت سے ناواقف تھا ۔ ۱۹۱۳ء میں جب یورپ نے ادب کا نوبل پرائز دے کر ادبیات کا تاج ٹیگور کے سر پر رکھا تو ساری دنیا حیران رہ گئی ۔

اُردو کے مشہور انشا پرداز نیازؔ فتحپوری نے سب سے پہلے گیتان جلی کا ترجمہ کر کے ٹیگور سے اُردو دنیا کو آشنا کرایا ۔ گیتان جلی کے ترجمہ کے بعد مختلف حضرات نے انگریزی اور بنگالی زبانوں سے ٹیگور کی اکثر تحریرات کا اُردو میں ترجمہ کیا جو مختلف اُردو رسائل میں شایع ہوتی رہیں ۔

ہم یہاں اُن افسانوں اور ڈراموں سے قطع نظر جو اُردو رسایل و اخبارات میں شایع ہوتے رہے ہیں صرف اُن کتابوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالینگے جو یا تو ٹیگور کی بعض تصانیف کا ترجمہ ہیں یا جن کا تعلق ٹیگور کی زندگی اور ان کی تحریرات سے ہے۔

۱- گیتان جلی اُردو کے مشہور انشاپرداز نیاز فتحپوری نے نذرِ نغمہ کے نام سے گیتان جلی کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ نیاز پہلے شخص ہیں جنہوں نے ٹیگور سے اُردو والوں کو واقف کرایا اور جس کی وجہ سے اُردو داں طبقہ ٹیگور کی اعلیٰ ادبی قابلیت سے واقف ہوا۔ نیاز نے گیتان جلی کا ترجمہ ایسی قادرالکلامی اور اعجاز بیانی سے کیا ہے کہ گیتان جلی اُردو میں ادبِ لطیف کی ایک غیرفانی کتاب بن گئی ہے۔ اشعار کی ظاہری خوبیاں، عبارت کا بے ساختہ پن، تصوف و روحانیت، اظہارِ جذبات اور الفاظ کی ادبی لطافت و بلاغت کو اُردو میں کامیاب طور پر منتقل کیا گیا ہے۔

اب تک اس کتاب کے دو ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں جس میں سے پہلا ایڈیشن خود نیاز نے نگار کے دفتر سے شایع کیا ہے۔ ترجمہ سے پہلے نیاز فتحپوری کا ۳۲ صفحات کا طویل مقدمہ درج ہے جس میں مترجم نے ٹیگور کی شاعرانہ خصوصیات، شخصی قابلیتوں، بنگالی ادب اور ٹیگور کے خاندان پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹیگور کو اُردو دنیا میں متعارف کرایا ہے۔ گیتان جلی میں ٹیگور کی تقریباً ایک سو چالیس (۱۴۰) سیاسی، مذہبی اور روحانی نظمیں شامل ہیں جن کی کل ضخامت ڈیڑھ سو (۱۵۰) صفحات ہے۔ گیتان جلی کا ترجمہ کرکے نیاز نے اُردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے بحیثیت گیتان جلی کے مترجم کے نیاز کا نام اُردو دنیا میں ہمیشہ باقی رہیگا۔

۲- پاکیزہ افسانے اس مجموعہ میں کل سات افسانے ہیں۔ جس میں سے چار افسانے یعنی وصیت، منشی جی، پوسٹ ماسٹر اور بھکارن ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ جن کو ام۔ اے امین اور گورکھ ناتھ کرتارپوری نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔

بقیہ تین افسانے لبیش، استاد کی تلاش اور نادان علی الترتیب بنگالی کے مشہور اور نامور ادیبوں شرت چندر چیٹرجی، گوبند بلبھ پنت اور شریمتی سیتا دیوی یم۔ اے کے افکاراتِ عالیہ کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کو گورکھ ناتھ کرتارپوری نے مرتب کیا ہے۔ یہ ترجمہ رف کاغذ کے ۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے اس کو کتابستانِ اُردو (لوہاری گیٹ، لاہور) نے شایع کیا ہے۔

۳- ٹیگور اور ان کی شاعری یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل فرزند جناب مخدوم محی الدین صاحب مخدوم ام۔ اے کی ایک تحقیقاتی اور معلومات آفریں تصنیف ہے۔ زبانِ اُردو کی روز افزوں ترقی کے باوجود ٹیگور کی زندگی اور تصنیفات سے متعلق صرف یہی واحد کتاب معلومات فراہم کرتی

ہے۔ اور اُردو کی اسی بے مائگی نے مصنف کو اس کتاب کی تصنیف پر مجبور کیا۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا دیباچہ عمومی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کی کتابوں کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا ہے۔ انتساب کے بعد مصنف کا دیباچہ ہے جس میں مصنف نے ٹیگور کی شاعری اور بین قومی عظمت و شہرت پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اصل کتاب سے متعلق لکھا ہے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ترتیب تاریخ وار ہے جیسا کہ خود مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "زندگی کے واقعات جیسے جیسے رونما ہوتے گئے اسی سلسلے سے ان کو درج کیا گیا ہے تاکہ شاعر کے ذہنی تغیرات اور اس کی شخصیت کی تکمیل کے ارتقائی منازل اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔"

اس کتاب میں مصنف نے ٹیگور کے گھرانے، پیدائش، بچپن، ابتدائی شاعری، سیاسی اور ادبی سرگرمیوں، ناول نویسی، ڈرامہ نویسی، غنائی شاعری، گیتان جلی، اخوت کی تعلیم، مغرب کا استقبال، گاندھی اور ٹیگور اور شانتی نکیتان، پر سیر حاصل بحث کی ہے ان عنوانات کے علاوہ ٹیگور کی اکثر تصانیف مثلاً سنیاسی، حلقہ بہار، گارڈنر، کرسنٹ مون، اور چترا وغیرہ پر بھی مصنف نے تبصرہ کیا ہے۔

یہ کتاب چکنے کاغذ کے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اس کو ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن نے شائع کیا ہے۔

مخدوم محی الدین صاحب کی یہ تصنیف اردو کی ایک بہت بڑی ادبی کمی کو پورا کرتی ہے اور ٹیگور جیسی بین قومی شہرت کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد و معاون ہے۔

۴۔ نیا چاند اُردو کے کامیاب مترجم اور انقلاب کے اڈیٹر جناب عبدالمجید صاحب سالک نے کرسنٹ مون کا ترجمہ "نیا چاند" کے نام سے انگریزی سے اردو میں کیا ہے۔ اس ترجمہ میں ڈاکٹر ٹیگور کی چھ دلاویز اور دلچسپ نظمیں ہیں۔ سالک صاحب نے ترجمہ میں ٹیگور کا اصلی رنگ پیدا کرنے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے۔

۵۔ ٹیگور کے افسانے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے تیرہ افسانوں کا ایک رنگین مجموعہ ہے جس کو ڈاکٹر تار سنگھ دلشاد نے بنگالی اور انگریزی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ میں افسانے کی ظاہری خوبیاں، عبارت کا بے ساختہ پن، کلام کی سادگی اور اظہار جذبات کو ایک حد تک کامیابی کے ساتھ منتقل کیا گیا ہے۔

اس مجموعے کے بعض افسانے پردیسی، شاعر کی فتح، ناکام محبت اور شاہکار ٹیگور کی اعلیٰ ادبی قابلیت اور بین قومی عظمت و شہرت کے آئینہ دار ہیں۔ سارے افسانوں میں سماج، محبت، حسن،

شاعری اور موسیقی کی روح کام کر رہی ہے۔ اس مجموعے میں ان افسانوں کے علاوہ کئی ایک مختصر افسانے بھی شریک ہیں جن کی فصاحت، الفاظ کا ترنم اور عبارت کی سادگی تعریف سے بالا تر ہے اور در اصل انہی شہ پاروں میں ٹیگور کی شخصیت جھلکتی ہے۔

٦۔ چترا — چترا شباب و شعر اور موسیقیت سے بھرا ہوا ٹیگور کا اعلیٰ ترین ادبی کارنامہ ہے جس کا قصہ مہا بھارت سے ماخوذ ہے۔ بنگالی ادب میں اس ڈرامے کو خاص اہمیت حاصل ہے ٹیگور نے اس ڈرامے میں اس خیال کو پھیلایا ہے کہ لامحدودیت کی تلاش اور اس کے حصول کی مسرت در اصل خود محدود میں مشہود ہے۔ بلند ترین تخیلات، حقیقی جذبات اور حسن و عشق کے اس نادر نمونہ کو عبد المجید صاحب سالک نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ الفاظ کی سادگی، عبارت کا بے ساختہ پن، اور لطیف جذبات و احساسات کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی سالک صاحب نے جو کوشش کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ خود ڈاکٹر ٹیگور نے بھی ان تراجم کو پسند فرمایا ہے۔

٧۔ خاموش حسن — نقاشِ فطرت نے خاموش حسن کے نام سے ٹیگور کے آٹھ افسانوں کو بنگالی سے اردو میں منتقل کیا ہے ان افسانوں میں سے خاموش حسن، ہڈیوں کا پنجر، آخری تو، انار کلی، گم گشتہ گوہر اور مزدور کی بہشت اردو زبان میں ایک خاص اہمیت اور قدردانی کے مستحق ہیں۔ لطیف جذبات و تخیلات، نازک خیالات اور تشبیہ اور استعاروں نے ان میں عجیب طلسمی اثر پیدا کر دیا ہے۔ بقیہ چار افسانے آپ بیتی، آزمائش کی رات، دولت کی نذر اور گھاٹ کی سرگزشت بھی اپنے اپنے مقام پر ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں یہ دو سو صفحات کی مجلد کتاب ہے جس کو جنرل بک ڈپو اندرون لاہوری دروازہ لاہور نے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا ہے۔

٨۔ رابندر ناتھ ٹیگور — بابو جانی کانت سوم کی کتاب رابندر ناتھ کو منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی نے بنگالی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جس میں اختصار کے ساتھ ٹیگور کے حالات کو سلیس اور سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے ٹیگور کی سیرت بیان کرنے کے لیے اپنی کتاب کو حسبِ ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

خاندانی حالات، نوشت و خواند، باہر کے نظارے، گھر کی تعلیم۔ ولایت کی سیر، کیفِ جذبات، تاجدار موسیقی۔ تاج زریں، عالمگیر فتح، مشرقی ایشیا میں اعزاز اور شانتی نکیتان۔

اس کتاب میں ٹیگور کے دادا دوارکا ناتھ اور والد دیوندر ناتھ کے علاوہ خود ٹیگور کی دو تصاویر شریک ہیں۔ جس میں سے ایک ولایت میں طالب علمی کے زمانہ کی ہے اور دوسری تصویر میں ٹیگور کو

کسی ڈرامہ کے ایک منظر میں دکھلایا گیا ہے۔
یہ کتاب چکنے کاغذ کے ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کو انڈین پریس لمٹیڈ الہ آباد نے کالی ۔کے مترا کے اہتمام سے ۱۹۳۴ء میں شایع کیا ہے۔

۹۔ باغبان یوں تو ٹیگور کی ہر تصنیف عالمگیر مقبولیت اور شہرت کی حامل ہے لیکن گارڈ نر خاص طور پر مقبول اور پسندیدہ ہے۔ اس کا ترجمہ اُردو، انگریزی اور عربی کے علاوہ دنیا کی اور زبانوں میں بھی ہو گیا ہے۔ گارڈ نر میں ٹیگور کی اس وقت کی نظمیں اور گیت شامل ہیں جبکہ وہ جوان تھے۔ گیتان جلی کی طرح گارڈ نر میں تصوف اور روحانیت کے درس نہیں ہیں بلکہ حسن و عشق کا روح پرور رومان اس کتاب کی روحِ رواں ہے۔ اس کتاب کو عبدالمجید صاحب سالک نے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرکے اُردو کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

۱۰۔ کلام ٹیگور کلام ٹیگور کے نام سے پروفیسر ضیاءالدین صاحب نے ٹیگور کی غزلیات اور گیتوں کو بنگالی زبان سے اُردو میں پیش کیا ہے۔ اس ترجمہ میں زیادہ تر وہ گیت لیے گئے ہیں جو شانتی نکتیان میں اکثر گائے جاتے ہیں اور نظمیں شاعر کی مختلف بنگالی تصانیف سے لی گئی ہیں۔ اس ترجمہ میں شاعر ٹیگور کے ایک سو بیس (۱۲۰) گیت اور نظمیں شامل ہیں جن کی کل ضخامت دو سو صفحات ہے۔ کتاب کے شروع میں انتساب ہے جس میں اعلیٰ حضرت کے اس فیاضیانہ عطیہ کے شکریہ اور اعتراف میں کتاب کو سلطان العلوم کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس کے صرفہ سے ڈاکٹر ٹیگور نے شانتی نکتیان میں شعبۂ اسلامی تعمیر کرایا۔

ابتداء میں مترجم کی ۴۱ صفحات کی ایک طویل تمہید درج ہے جس میں ٹیگور کی شاعرانہ خصوصیات، شخصی عظمت و شہرت، ٹیگور کے موضوع شاعری اور بنگالی زبان میں ٹیگور کے ادب پر اختصار سے بحث کی گئی ہے۔

چونکہ پروفیسر ضیاءالدین صاحب نے یہ ترجمہ خاص بنگالی سے اُردو میں کیا ہے اس لیے اس میں ان تراجم کے مقابلہ میں جو انگریزی سے اُردو میں کیے گئے ہیں بہت بڑی حد تک حقیقت اور اصلیت جھلکتی ہے۔ ترجمہ کے لیے مترجم نے جو زبان استعمال کی ہے اس میں ادبی شان اور ادبی لطافت و بلاغت کو خاص جگہ دی گئی ہے۔ ترجمہ میں شاعر کے کلام کی ظاہری خوبیاں، اشعار کی آمد و سلاست، خلوص بیان اور طرزِ ادا کی دل نشینی غرض ان تمام خوبیوں کو جو ٹیگور کی شاعری کی روحِ رواں ہیں پروفیسر ضیاءالدین صاحب نے اُردو میں لانے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے۔

...۲ صفحات کی یہ ٹائپ کی کتاب سٹی پریس الہ آباد میں چھپ کر کشوری موہن شاستری کے اہتمام سے وشوا بھارتی بک شاپ (۲۱۰) کارنوالس اسٹریٹ کلکتہ سے ۱۹۳۵ء میں شایع ہوئی ہے۔

۱۱۔ معیاری افسانے

اس کتاب میں یورپ کے مشہور افسانہ نگاروں اور انشا پردازوں کے اٹھارہ(۱۸) منتخب افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کو مختلف حضرات نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور ابو الاثر حفیظ جالندھری نے منتخب و مرتب کرکے اپنے اہتمام سے دفتر شاہنامہ اسلام ماڈل ٹاون لاہور سے ۱۹۳۳ء میں شایع کیا۔

انہی منتخب افسانہ نگاروں میں ایک ٹیگور بھی ہیں جن کا ایک افسانہ "شکست کی فتح" شریک کتاب ہے۔

۱۲۔ افسانۂ بنگال

اردو کے مشہور مترجم منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے بنگال کے چار مشہور افسانہ نگاروں کے آٹھ دلچسپ اور پسندیدہ افسانوں کو بنگالی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اب تک اس کتاب کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پہلا ۱۹۱۳ء میں اور دوسرا ۱۹۲۳ء میں۔

کتاب کے شروع میں مترجم کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اردو میں مختصر افسانہ نگاری پر بحث کی ہے۔ ان آٹھ افسانوں میں سے چار افسانے غلطی، گنگا کے گھاٹ کی سرگذشت، ہڈیوں کا پنجر اور آزمائش کی رات ٹیگور کے ادبیات عالیہ ہیں اور باقی چار یعنی دودھ کا دودھ پانی کا پانی، قسمت کا سایہ، ویران محل کی روحیں اور منزل عشق علی الترتیب مسٹر ایچ۔ سی دت، مسٹر این گپت، شریمتی ستیہ دیوی اور بابو پربھات کمار مکرجی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کو لالہ جگن ناتھ سہگل نے اپنے اہتمام سے خبر دار اسٹیم پریس لاہور میں ۱۹۲۳ء میں چھپوایا اور نرائن دت سہگل اینڈ سنز نے شایع کیا۔ کتاب کی کل ضخامت ۱۳۵ صفحات ہے۔

۱۳۔ ٹیگور کی دلچسپ کہانیاں

مولانا عشرت رحمانی صاحب نے ٹیگور کی دلچسپ کہانیوں کے نام سے بچوں کے لیے ٹیگور کی نو کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

ان میں سے بعض کہانیوں کے عنوان یہ ہیں۔ چھوٹے بابو کا نوکر، ایک بادشاہ تھا، بے زبانی کی کہانی اور چھٹی کا دن۔ شروع میں مترجم نے دو دو باتوں کے عنوان سے بچوں کو مخاطب کیا ہے اور ٹیگور سے بچوں کو متعارف کرایا ہے۔ ٹیگور کی عظمت و شہرت کا حال بیان کرتے ہوئے بچوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ بھی ایسے ہی مشہور بننے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد ڈاکٹر سر رابندر ناتھ کے عنوان سے ایک مضمون درج ہے جس میں صاف، سادہ اور سلیس زبان میں ٹیگور کے حالات اجمال کے ساتھ بچوں کے

ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساری کہانیوں میں قصّوں کے ذریعہ بچّوں کے لیے نصیحت آمیز باتیں بتائی گئی ہیں اور اچھے کاموں کے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ سادہ اور معمولی عبارت ہے اور موٹے موٹے حروف تاکہ بچے آسانی سے پڑھ سکیں اور سہولت سے سمجھ سکیں۔ عشرت رحمانی صاحب نے ترجمہ بھی بڑی خوبی سے کیا ہے یعنی کتاب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ طبعزاد کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ کتاب کی کل ضخامت ۱۹۱ صفحات ہے۔ اس کتاب کو عبدالمجید خاں نے اپنے اہتمام سے فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۱۹۔ سرکلر روڈ لاہور سے ۱۹۶۲ء میں طبع کروایا۔

۱۴۔ ترکش مسٹر شاد کنج کاہی نے ٹیگور کے نو افسانوں کو بنگالی سے اُردو میں ترجمہ کرکے ترکش کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ اس مجموعے کے سارے افسانے ٹریجڈی ہیں۔ ابتدا میں جناب درگاداس صاحب منوّہر کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے ٹیگور کی افسانہ نگاری کی اعلیٰ قابلیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی بین قومی شہرت وعظمت کو بیان کیا ہے اور آخر میں بہترین ترجمہ پر مترجم کی قابلیت کی داد دی ہے۔ ویسے تو اس مجموعے کے سب افسانے منتخب ہیں لیکن خونِ تمنّا، سنگ آتش سنگ دلی اور آزادی کا دیوتا ہر لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان نو افسانوں کے علاوہ چار مختصر افسانے بھی شریک ہیں جس میں ٹیگور نے اپنے لطیف جذبات و احساسات کو الفاظ کے پیکر میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ کتاب کی کل ضخامت ۲۰۳ صفحات ہے۔ کتابت اور طباعت نہایت اعلیٰ ہے۔ سرورق رنگین اور دیدہ زیب ہے اور کاغذ، چکنا، دبیز اور صاف ہے اس کتاب کو بھارت پستک بھنڈار گڑھ اہوالیہ امرتسر نے شایع کیا ہے۔

۱۵۔ سرد شعلے اس کتاب میں ڈاکٹر ٹیگور کے پندرہ منتخب افسانے شامل ہیں جن کو شانتی نرائن شادؔ نے بنگالی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور بھارت پستک بھنڈار نے شایع کیا۔ ابتدائے کتاب میں خود مترجم کی مختصر تمہید درج ہے جس میں انھوں نے ٹیگور کی عالم گیر عظمت و شہرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے بعض ترجموں پر جو ٹیگور ہی کی تصانیف سے متعلق ہیں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اور آخر میں اصل کتاب یعنے افسانوں کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر طویل افسانے کے ساتھ ایک مختصر افسانہ بھی شریک ہے اس طرح کل ۳۲ افسانے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ کتاب کی کل ضخامت ۲۰۷ صفحات ہے، کتاب مجلد ہے اور سرورق رنگین و دیدہ زیب، کتابت طباعت بہترین ہے اور کاغذ عمدہ ہے۔

۱۶- طوفان "طوفان"، ڈاکٹر ٹیگور کا ایک ناول ہے جس کو شانتی نرائن شاؔد نے بنگالی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اپنے اس ترجمہ کو شاؔد نے ہر کرشن لال جی کو رجہ کی نذر کیا ہے۔ کتاب کی ظاہری خوبیوں میں بہت فیاضی سے کام لیا گیا ہے۔ چکنے کاغذ کے ۲۴۷ صفحات پر یہ ترجمہ پھیلا ہوا ہے جلد نہایت رنگین ہے اور اس میں ایک کشتی کو سمندر کے بیچ ہچکولے کھاتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ سرورق بھی نہایت دیدہ زیب ہے اور کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔

لیکن ان ظاہری خوبیوں سے قطع نظر ترجمہ ہر لحاظ سے نہایت بھدا ہے۔ شاؔد صاحب نے ٹیگور کی اکثر تحریرات کو اُردو میں ترجمہ کیا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شاؔد کے یہ سارے ترجمے زبان کے لحاظ سے نہایت بھدے اور ترجمہ کے لحاظ سے نہایت بے جان ہیں۔ ٹیگور کی نازک خیالی حسن بیان اور لطیف تشبیہوں اور استعاروں کو شاؔد نے اپنے اُردو ترجمہ میں بہت بری طرح مجروح کیا ہے۔ شاؔد کے سارے ترجمے بے جان جسدِ خاکی ہیں جن میں ٹیگور کی ادبی روح مفقود ہے۔ ان تراجم کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاؔد نے یہ ترجمے ٹیگور کے اثر کو اُردو میں منتقل کرنے کے لیے نہیں کیے ہیں بلکہ اپنی ذاتی منفعت اور اپنے ذاتی فائدہ کے لیے ٹیگور کی تصانیف کو خواہ مخواہ اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

اس کتاب کو بھی بھارت پستک بھنڈار بازار گھنٹہ گھر امرتسر نے ۱۹۳۹ء میں شایع کیا۔

۱۷- جیون پربھات "جیون پربھات" بھی ٹیگور کا ایک دلکش ناول ہے جس کو شانتی نرائن شاؔد نے اُردو میں ..... منتقل کیا ہے۔ اس کتاب کو شانتی نرائن شاؔد نے اپنے مہربان دوست سیٹھ بھوگند ناتھ جوشی کی نذر کیا ہے۔ یہ ناول ۱۶ ابواب میں تقسیم ہے جس کی کل صفحات ۲۵۲ صفحات ہے۔ اس کتاب کو بھی بھارت پستک بھنڈار بازار گھنٹہ گھر امرتسر نے شایع کیا ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور کاغذ چکنا اور صاف۔ لیکن غلط ترکیبوں، بھونڈے لفظوں اور عبارت کی بے ربطی نے ٹیگور کی اس ناول کی ساری دلکشی کو جذب کر لیا ہے۔

۱۸- محبت کے پھول رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور ڈرامہ "دا اکینڈرس" کا آزاد ترجمہ جناب فرید مچھلی شہری نے "محبت کے پھول" کے نام سے اُردو میں کیا ہے۔
ابتدائے کتاب میں سر محمد عبد اللہ المامون سہروردی کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے ترجمہ کی تعریف کرتے ہوئے ٹیگور کے اصلی ڈرامہ کے نفسِ مضمون سے بحث کی ہے اور ترجمے کے چند ٹکڑے پیش کیے ہیں۔
مقدمے کے بعد انتساب ہے جس میں کتاب کو فرید صاحب نے اپنے ماموں مولوی محمد حسین صاحب رئیس اعظم

مچھلی شہر کے طرف منسوب کیا ہے۔ اس کے بعد شوکت علی صاحب فہمی نے "تعارف" لکھا ہے۔ تعارف کے بعد مصور فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی تقریظ ہے اسمیں خواجہ حسن نظامی صاحب نے فرید صاحب کی ادبی زندگی اور ان کے گھر کے شاعرانہ ماحول پر اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں مترجم نے "افسانۂ ما" کے عنوان سے اپنی ادبی زندگی اور ترجمے کے متعلق کچھ لکھا ہے۔

"محبت کے پھول" فرید صاحب کی پہلی ادبی کوشش ہے اس لیے یہ ایک کامیاب کوشش کہی جاسکتی لیکن اگر اس کو ترجمہ کے صحیح معیار پر جانچا جائے تو فرید صاحب کی یہ کوشش اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔

معمولی کاغذ کے ۱۲۹ صفحات پر فرید صاحب کا یہ ترجمہ خواجہ برقی پریس جامع مسجد دہلی نے سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع کیا ہے۔

رفیع الدین فاروقی
متعلم سال اول

رابندر ناتھ ٹیگور کا پیغام

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے　　عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

رابندر ناتھ کے ابتدائی اور عنفوانِ شباب کے کلام میں کسی پیام کو ڈھونڈنا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ ایک عبوری دور تھا۔ چنانچہ "باغبان" میں حُسن و عشق کے جذبات موجیں مارتے نظر آئیں گے۔ اور "نیا چاند" اور "نذر نغمہ" میں فلسفیانہ اور حکیمانہ تخیلات کی کارفرمائیاں پائی جائینگی۔ گویا "باغبان" میں شانِ تغزل ہے تو "نیا چاند" اور "نذر نغمہ" میں مناجاتیں اور روحانیات۔ وجہ ظاہر ہے شاعر خود کہتا ہے۔ "معاف کرنا میں بھی کبھی جوان تھا۔" بعض پرستارانہ ذہنیتیں شاعر کے ہر فکرِ شعری میں تصوف تلاش کرتی ہیں۔ چنانچہ شاعر خود بھی اس قسم کی ذہنیت والوں پر تاسف کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ میری ہر تحریر کو تصوف سمجھتے ہیں۔"

"نذر نغمہ" کی تصنیف سے پہلے وہ عبوری دور سے گذر رہے تھے لیکن "نذر نغمہ" کے بعد وہ صرف آرٹسٹ یا عاشق ہی نہیں رہے بلکہ معلم اخلاق، فلسفی اور مصلح بھی بن گئے۔ گویا اب وہ اپنے اصلی مقام پر پہنچ گئے تھے۔ اور یہیں سے ہم ان کے "پیامات" سنتے ہیں جن میں روحانی کیف اور صلح و آشتی کا سرور پایا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف قومی شاعر تھے بلکہ پیامبر فطرت بھی۔ انکی نگاہِ دوررس ہمارے جذبات و احساسات کا مطالعہ کرتی تھی اور وہ اپنے اسی مطالعہ کو بیان کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے منظوم اور منثور افکارات ہماری مسرت و آرام، امید و بیم، توہمات و عقاید کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا پیام ہمارے لئے خالص "درس انسانیت" ہے۔ ان کے افکار عالیہ تنگ نوعیت کے حامل نہیں بلکہ عالمگیر وسعت رکھتے ہیں۔ وہ تخیلات

کی دنیا میں گم ہو کر ہمارے مستقبل کا ایک نظام مرتب کرتے تھے۔ مغربی فضا میں وطنیت اور قومیت کی بھیانک بدیوں کو امنڈتے ہوئے دیکھ کر اقبال کی طرح مغربی تنگ ذہنیتوں سے متنفر ہو جاتے تھے۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں انھوں نے اہل یورپ کے اصلی خیالات کا پتہ لگا لیا اور اپنے ملک والوں کے لئے راہِ نجات تلاش کر لی تھی۔ چنانچہ ان کا ایک خط جو کہ سی، ایف انڈریوز کے نام ہے اس خیال کا آئینہ دار ہے:۔

" یہاں ہر طرف ایشیا کے خلاف جذبہ نفرت پھیلا ہوا ہے۔ فکروں کو زندہ جلایا جاتا ہے بعض اوقات محض اس بنا پر کہ وہ قانوناً عطا کئے ہوئے حق رائے دہی کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس ملک میں جتنا زیادہ رہتا ہوں اتنا ہی مجھے حقیقی نجات کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ ہندوستان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو عقل کے امرت سے ہمیشہ معمور رکھے جس سے ایک نئے عہد اور شاندار مستقبل کی پرورش ہوگی۔ میں امن کے قلب میں رہنا چاہتا ہوں میں نے اپنا کام ختم کر لیا ہے اور امید کرتا ہوں کہ میرا مالک مجھے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیگا۔ باتیں کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی عظیم خاموشی سننے کے لئے۔"

وہ سرمایہ دار مغرب کے آگے مفلس مشرق کو محض اسلئے سرنگوں دیکھنا نہیں چاہتے تھے کہ وہ نکبت وغربت کا مارا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ دولت ایک اضافی چیز ہے حقیقی مسرت سے مغرب کی فضا ناآشنا ہے۔ جب وہ دیکھتے تھے کہ " دولت کے خداؤں" کے آگے مشرقی آتے ہوئے شرماتے ہیں تو چیخ اٹھتے:۔

"میرے بھائیو! ان سفید و پرکار لباسوں میں ملبوس مغروروں کے آگے آتے ہوئے شرمندہ مت ہو۔ انکسار سے اپنا تاج مرصع کرو۔ تمھاری آزادی روحانی آزادی ہے۔ روزانہ خداوند قدوس کے تخت کو اپنے خشک، پژمردہ اور افلاس زدہ چہروں سے آراستہ کرو۔ یقین مانو، ہر وہ چیز جو چمکیلی ہوتی ہے ہیرا نہیں۔ غرور کبھی دیرپا نہیں ہوتا۔"

وہ توحید کے قائل تھے اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں نور وحدت کو جگمگاتا دیکھتے تھے:۔

" وہ خدا جو آگ میں ہے جو پانی میں ہے جو تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے میں اُس " خدائے واحد" کو پیہم سجدے کرتا ہوں۔"

مذاہبِ عالم کے مختلف طرز عبادت کو وہ نہیں مانتے تھے۔ ان کا مقصد اعلیٰ تھا صرف تصورات مذہب کے ظواہر کو تج کر اس کی روح پر سختی سے کاربند رہنا ہی مقصد مقدس ہے۔ عبادت گاہوں اور نیچی قباؤں کی الٹ پھیر میں مذہبی روح نہیں سما سکتی بلکہ دورِ حاضر میں ہمکو عبادت گاہوں اور ظاہری رسومات کی ضرورت نہیں۔ جس چیز کی ہم کو ضرورت ہے وہ " آشرم" ہے۔ ہمارے لئے ایک ایسا مقام چاہئے

جہاں حسن فطرت اور علویت انسانی میں ایک خوشگوار توازن پیدا ہو سکے۔ ہماری عبادت گاہ وہ مقام ہے جہاں مظاہر قدرت اور انسان کی روح میں اتحاد ہوتا ہو۔ ہمارے مذہبی رسومات اور ارکان صرف ایثار اور عمل صالح ہو سکتے ہیں۔"

موجودہ طرز تعلیم کے وہ مخالف تھے۔ اسی لئے آشرم کی ضرورت محسوس کرتے تھے کیوں کہ موجودہ تعلیم یافتہ اپنے مغربی ہمعصر کی ایک ناقص نقل ہے اس کی آواز صدائے بازگشت ہے اسکی زندگی اوروں کا کہا ہوا مقولہ ہے۔ اسکی روح ایک دماغ اور اسکی آزاد روح ایشیا کی غلام ہے اسلئے کہ موجودہ تعلیم سے ایک غلامانہ دماغ کی پرورش کی ہے" (رادھا کرشنا)

ٹیگور کا فلسفہ ٹھوس تصوری ہے۔ وہ سرتا پا تصور ہے۔ ایسا تصور جس میں جسم اور دماغ، مادہ اور روح، فرد اور معاشرہ اور فرد و قوم میں بے تعلقی اور جغرافیائی حد بندی کی گنجائش نہیں۔ گویا وہ عالمگیر وسعت رکھتا ہے، زمان و مکان کی تبدیلی اور امتیاز رنگ و بو کی تحدید اس فلسفہ پر عائد نہیں کی جا سکتی۔

ان کا مذہبی پیام کلیتاً فطری اور سادہ ہے " مذہب کی روح میں سما جاؤ اور ظواہر کو تج دو" وہ کنج نشین ہو کر عرفان حاصل کرنے کو لغو سمجھتے تھے۔ وہ رجائی تھے فطرت کی رعنائیاں اور قدرت کی گل کاریاں ایسی نہیں جن سے وہ لطف اندوز ہونے کا خیال مٹا سکتے۔ فطرت کی ساری لطافتوں اور نکہتوں سے لطف اندوز ہونے ہی میں روحانی بالیدگی ہے اسلئے کہتے ہیں:۔

" یہ رام نام جپنا اور تسبیح پھیرنا چھوڑ دے۔ کواڑ بند کئے خانقاہ کے سنسان اور تاریک کنج عزلت میں کس کو تلاش کر رہا ہے؟ آنکھیں کھول اور دیکھ تیرا خدا تیرے سامنے ہے"

وہ خدا کے درشن غریبوں کی کٹیاؤں میں کاشتکاروں کے کھیتوں میں اور مزدوروں کے جھگھٹوں میں کرتے ہیں:۔

" خدا وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں کاشت کر رہا ہے اور جہاں سڑک پر روڑے کوٹنے والا پتھروں کو بیٹھا کوٹ رہا ہے۔ وہ دھوپ میں اور بارش میں تیرے ساتھ ہے۔ اور اس کے کپڑے خاک آلود ہیں۔ خرقۂ سالوس اُتار پھینک اور اسی طرح خاک پر اُتر آ"

گاندھی اور ٹیگور کو مشرق بھول نہیں سکتا۔ ان دونوں کی شہرت کے ڈنکے چہار دانگ عالم میں بج چکے، لیکن ان ہمعصروں کے زاویہ نگاہ میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ رومن رولاں نے کیا خوب کہا ہے "ٹیگور ہمارے دور کے افلاطون ہیں اور گاندھی سینٹ پال" ٹیگور زندگی کی رنگینیوں کو تج نہیں سکتے۔ فطرت کی ساری رنگینیاں اپنے لئے " دعوت دہ پیام عبودی" ہیں۔ ان کی نگاہ حسن کارانہ ہے، ان کا

دماغ فلسفیانہ اور انکی طبیعت شاعرانہ اور گاندھی جی محض قنوطی، ایک خشک معلم اخلاق اور راہب قسم کے انسان ہیں زندگی کی ساری رنگینیوں کو تج دینے میں نجات سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ان دو مفکروں کے سیاسی خیالات میں بھی تضاد ہے۔ ٹیگور ترکِ موالات کے مخالف تھے وہ سمندر پار اتحاد و آشتی کے گیت گا رہے تھے جبکہ ہندستان میں تحریک ترک موالات زوروں پر تھی۔ وہ نفرت کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ محبت کی، اسلئے کہ روحانی فتح میں درآصل کامرانی اور شادمانی مضمر ہے۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے گاندھی جی اور اپنے مسلک کو واضح کیا ہے :-

"مہاتما گاندھی کو اس راہ کا رہبر صادق بننے دو۔ انھیں حقیقی خدمت کے لئے بلانے دو۔ قربانی اور ایثار کا خراج طلب کرنے دو۔ جسکی انتہا محبت اور تخلیق ہے۔ میں نہایت خوشی سے ان کے قدموں پر گر جاؤں گا۔ اور میں ان کا ہر حکم بجا لاؤں گا جو وہ مجھے اپنے ہم وطنوں سے تعاون خدمت اور محبت کے لئے دیں۔ مگر میں آدمیت کے خون کو غصہ اور حقارت کی آگ روشن کرنے اور اس آگ کو ایک گھر سے دوسرے گھر کو لگانے پر ضائع کرنے سے انکار کر دوں گا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میرے دل پر اغیار کی ناانصافیوں اور ان توہینوں کا جو انھوں نے میرے ملک کی کی ہیں کوئی صدمہ نہیں ؟ بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ غصہ محبت کی آگ میں تبدیل ہو جائے جس سے میں پرستش کا چراغ روشن کروں اور اپنے ملک کے ذریعہ اپنے معبود کے حضور میں پیش کر سکوں"۔

ٹیگور اغیار کی ناانصافیوں اور مظالم کا ترکی بہ ترکی جواب بھی دیتے تھے۔ جلیان والے باغ کے مظالم سے وہ اتنے متاثر ہوئے تھے کہ نائٹ ہڈ کا خطاب ان الفاظ کے ساتھ واپس کر دیا :- "اب وہ وقت آگیا ہے کہ اعزازات کے علامات کو ہم ان بے شمار ذلتوں میں سے ایک اور ذلت کا اضافہ سمجھیں" لیکن وہ روح پرست تھے اسلئے مادہ پرستوں کی حماقتوں اور سوداگرانہ ذہنیتوں کی بیہودگیوں کا جواب تشدد اور ستیاگرہ کے اصول پر دینا پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے روحانی تازیانے ایسے تھے کہ جس کے زخم برسوں ہرے رہتے۔

ان کا مقصد اصلی ہندستان کا تجدید نظام تھا۔ فرقہ پرستی، لسانی مناقشے اور صوبہ واری اختلافات کو مٹا کر بین ہندی بھائی چارہ قائم کیا جائے۔ ہر ہندستانی کا فرض مقدس ہے کہ قومی تخیل کو زندہ کرے فرقہ پرستی کے متعفن جذبات کو تج کر دھرتی ماتا کی خدمت میں مصروف ہو جائے اس لئے کہ دھرتی ماتا کی شریان سے ہر ایک نے برابر کا امرت رس پیا ہے۔ ہندستان اس کے آبا و اجداد کا قابل تکریم ملک ہے۔ یہیں اس کے بزرگوں نے مساوات، صلح و آشتی کے منوہر اور اچپل گیت گائے تھے ان راگوں کو دوبارہ گا گا کر البیلے

شبدوں کو دہرا دہرا کر پہلی سی شکتی حاصل کرے تاکہ روحانیوں کی بستی سے مادہ پرست اپنا بوریا بستر لپیٹ کر سدھاریں۔

ٹیگور کے خیال میں ملک کی ترقی کے لئے کارخانوں کی بہتات، صنعتی فروغ، مشینوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوائی جہازوں کی سنسناہٹ، ملک گیری کی ہوس، جنگ کی آتش خیز تیاریوں کی ضرورت نہیں۔ ان کا نصب العین اس سے کہیں بلند تھا۔ وہ روحانی خوشحالی اور کامرانی چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی تھیں، جب وہ دیکھتے تھے کہ مشرقی انسان مادی فوائد کی خاطر مغربی رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور اپنی علویت، رفعت اور روحانیت کو چھوڑ کر محض مشین بنکر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

" دنیاوی کاروبار ہماری کامل توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ پیدائش اور صرف دولت میں ہماری تمام تر قوتیں ضائع جارہی ہیں اور ہمیں فطرت میں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دیتی جس کا تعلق ہم سے ہو۔ ہم نے اپنے دلوں کو وقف کر دیا ہے، ایک نہایت ہی ادنی چیز کے حصول کے لئے، سمندر جو چاند کے لئے اپنی آغوش انتظار کھولے ہوئے ہے، ہوا جو ہر وقت شور مچاتی رہتی ہے اور پھر پژمردہ پھولوں کی طرح سمٹ جاتی ہے یہہ اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے ہم لذت گیر نہیں ہوتے فطرت ہم کو متاثر نہیں کرتی۔ اے خدا" وہ روح کو خوابیدہ کرنے والی ساری چیزوں کو فنا کر دینے کی تلقین کرتے تھے، اور مادی فوائد کی خاطر بانی رفعتوں، یزدانی صلاحیتوں اور انسانی برتری کو کسی قیمت پر نہیں دیسکتے تھے۔ چنانچہ اپنے مالک حقیقی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :-

" تو نے ہمیں زندہ رہنے پیدا کیا ہے۔ ہم اس عزت کو پوری قوت اور ارادے سے برقرار رکھیں گے۔ کیونکہ تیری خوشنودی اور شان اسی میں ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ اسلئے تیرے نام پر اس قوت کا مقابلہ کریں گے جو ہماری روح پر قبضہ کرے "

اس کے یہہ معنی نہیں کہ ٹیگور روح کی بالیدگی اور معراج کے لئے مادی ترقیوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے بلکہ وہ روح اور مادہ میں توازن کے خواہاں تھے :-

" تمھیں معلوم ہے کہ مغربی تہذیب کا میں قائل نہیں جیسا کہ میں اس کا قائل نہیں کہ انسان کی عظیم ترین قوت صرف جسمانی طاقت ہے ساتھ ہی ساتھ میں اس کا بھی قائل نہیں کہ قوت جسمانی کو ڈھا دیا جائے اور مادی طاقتوں سے منہ موڑ لیا جائے۔ حقیقت میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہہ ہے کہ روح اور مادہ میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ یہہ توازن بالکل بنیادی اور دُھچو کا توازن ہے "

ٹیگور قوم پرست تھے لیکن انکی قوم پرستی مغربی اصولوں کی اساس پر نہ تھی۔ مغربی قوم پرستوں کی طرح

ان کے مسلک میں اپنوں سے محبت کے یہ معنی نہ تھے کہ اوروں سے بیر رکھا جائے اپنی بھلائی کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے۔ جغرافیائی حدود کی وسعت کے لئے آزاد قوموں کو غلام بنا لیا جائے۔ مہذب اور ترقی یافتہ بنانے کے بہانے حکومت کے ڈھنگ ڈالے جائیں بلکہ انکا جذبۂ قومی عالمگیر محبت کے مترادف تھا اسی لئے وہ کہتے تھے کہ مشرق کی بقا اور بہبود اسکی اپنی روحانیت میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ وہ سوراج کے متعلق کہتے ہیں:۔

"سوراج کیا ہے؟ مایا ہے، ایک غبار ہے جو ابدی تجلیوں کو چھوڑے بغیر غائب ہو جائیگا۔ ہم کتنا ہی مغرب کے سکھائے ہوئے فقرے کو رٹا کریں مگر ہمارا نصب العین سوراج نہیں، ہماری جنگ روحانی جنگ ہے یہ انسان کے لئے ہے۔ ہمیں انسان کو ان بندھنوں سے آزاد کرنا ہے جو اس نے اپنے اطراف باندھ لئے ہیں اور یہ بندھن قومیت کے منظم ادارے ہیں؛ تیتری کو ترغیب دلائی جائے کہ اپنے گھر کی بہ نسبت آسمان کی بسیط فضا میں زیادہ آزادیاں ہیں۔ جب روحانیت نے دولت، اسلحہ اور طاقت کو فتح کر لیا تو یہی انسان کا سوراج ہے۔ روحانی آزادی اصلی آزادی ہے۔"

ان کے قومی تخیل پر کسی فرنگی نے تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان میں قومیت کا نہ پایا جانا ہی اسکی کمزوری اور ذلت کا باعث ہے، انھوں نے جواب دیا کہ:۔

"وہ خاک جس پر ہندوستانی جھکے ہوئے ہیں۔ ان محلوں اور ایوانوں سے زیادہ مقدس ہے جو قوت اور افتخار کے نام نہاد اینٹ اور گارے سے بنے ہیں کیونکہ یہ خاک زندگی حسن اور پرستاری سے معمور اور زرخیز ہے۔"

ایک مغربی قوم پرست کہتا ہے "صرف ملک سے محبت رکھنا کافی نہیں۔ پورے طور پر مسلح ہو کر محبت کرو۔ ہر اس وجود سے نفرت کرو جو اپنا نہیں۔ ایسی نفرت مقدس ہے اور قابل احترام بھی" اس کے خلاف مشرقی روحانی مفکر رابندر ناتھ کی پوتر آرزو بھی سن لیجئے گا۔ "جہاں دماغ قوت سے خالی اور بلند سر ہے جہاں دنیا تاریک دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوئی، جہاں دماغ وسیع نیت اور عمل صالح کے ساتھ بڑھ رہا ہو۔ او مالک آزادی! آسمانوں میں میرے ملک کو پیدا کر"

- جاپان بھی ایک حصۂ مشرق ہے اسلئے مغربی قومیت کا وہاں راج دیکھکر ٹیگور بھی چیخ اٹھتے ہیں۔ جاپان بھی ہمیں لوگوں میں سے تھا۔ مگر مغرب نے اپنی گرجدار توپوں کی آواز سے کہا کہ تم قوم بنو اور وہ قوم بن گیا۔ اور جب تمہارے سامنے جاپانی قومیت کا کارنامہ پیش کیا جاتا ہے تو تم بھی سر ہلاتے ہو کہ اچھا ہے؟ حالانکہ وہ روحانیت اور تنوع کو غارت کر کے مغرب کے رنگ میں رنگ گیا۔

"جاپان دولت انسانیت، حسن اور حب الوطنی کے توازن سے مالا مال تھا مگر مغرب نے اس کے احترام کو اسوقت تک تسلیم نہ کیا جب تک جاپان نے یہہ ثابت نہ کر دیا کہ ابلیس کے خونخوار کتے نہ صرف یورپ کی خندقوں میں ہیں بلکہ جاپان میں بھی پرورش پاتے ہیں جنکی غذا انسانی مصائب ہیں۔"

صاف ظاہر ہے کہ ٹیگور مغربی نام نہاد قومیت سے متنفر ہے اور مشرقی روحانیت میں ابدی مسرت پنہاں سمجھتے تھے۔ بعض متعصب نقادوں نے ان کے سر یہہ الزام دھرا ہے کہ وہ مغرب کے برکات سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کرتے تھے۔ اور مشرق کی ہر برائی، بھلائی کو سراہتے تھے۔ یہہ تنقید حقیقت پر مبنی نہیں اسلئے کہ عالمگیر محبت سے سرشار دل میں ایسی کینہ توزی کو دخل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ شاعر خود کہتا ہے کہ "انسان کی تمام اعلیٰ کارگذاریاں اور اسکی عظیم ترین شوکتیں مجھے اجازت دو کہ میں انھیں اپنا کہوں" اگر وہ مغربی اصول قومیت سے متنفر تھے تو اس میں تصور مغربی رعونت، ملک گیری، حرص و آز کا تھا خود ان کا نہیں۔ وہ کائنات کی ہر اچھائی کو برابر چاہتے تھے چاہے وہ مغرب میں ہو کہ مشرق میں۔ وہ ذرہ ذرہ کو روحانیت سے معمور کر کے ایک ایسا ماحول اور ایک ایسی فضا مہیا کرنا چاہتے تھے کہ جس کی:-

"ہر سانس میں ایسا محسوس ہو کہ ذاتِ عظیم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

سید احمد حسینی شاہد متعلم سالِ دوم

کیمرہ

بچپن سے مجھے کیمرہ سے دلچسپی ہے جب کبھی فرحت بھیا اپنی اور اپنے دوستوں کی اور ساتھ ہی ہماری تصویریں لیتے تو میں سوچتا کہ اتنے سے ڈبے سے ایسی اچھی اچھی تصویریں کس طرح اتر آتی ہیں اور اس میں کونسی ایسی چیز ہے جس سے یہ سب کچھ ہوتا ہے کسی سے پوچھتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کوئی مجھے ناواقف سمجھ کر بنانا نہ شروع کر دے۔ میں کمرہ کو اندر کی طرف سے دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کی حقیقت معلوم کر سکوں۔ میری کم سنی کی وجہ سے کوئی مجھے اپنا کیمرہ نہ دیتا تھا۔ جب کبھی مجھے کسی کا کیمرہ ہاتھ میں لینے کا موقع ملتا تو میں سب سے پہلے اسے کھولنے کی کوشش کرتا اور وہ لوگ میرے ہاتھ سے کیمرہ چھین لیتے کہ میں کہیں خراب نہ کر دوں۔ فرحت بھیا چونکہ اپنا کیمرہ ہمیشہ صندوق میں رکھتے تھے اس لیے وہ دسترس سے باہر تھا۔

ایک دن فرحت بھیا نے ناشتے کے بعد کیمرہ نکالا اور باہر لے گئے۔ دوپہر کے قریب لوٹے، بچوں سے کہنے لگے "دیکھو آج ہم تمھاری تصویریں لیں گے، تم لوگ کپڑے پہن کر تیار رہنا، ہم ابھی آتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ میں ان کے کمرے میں جھانکا، ان کا خوش نما کیمرہ سامنے رکھا تھا۔ کیمرہ کو دیکھنے کا اس سے بہتر کونسا موقع ہو سکتا تھا، کیمرہ سامنے اور فرحت بھیا باہر خوشی سے میرا دل اچھلنے لگا مسرت کی انتہا نہ تھی، میری مدت کی آرزو پوری ہونے والی تھی۔ میں کمرے میں گھس گیا اور آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ — کیمرہ سامنے رکھا تھا، میرے ہاتھوں میں تھرتھراہٹ سی پڑ گئی میں نے آگے بڑھ کر کیمرہ اٹھا لیا۔ ہر گھڑی یہ ڈر تھا کہ کہیں کیمرہ ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے اور فرش پر گر کر شور نہ پیدا کرے۔ جس صورت میں ہماری خوب درگت بنتی۔ میں نے کھٹکے ہٹا دیے، کیمرہ کھل گیا، اندر ایک لال کاغذ کی پٹی لپٹی ہوئی تھی، کچھ اوپر کی چرخی پر اور کچھ نیچے کی چرخی پر۔ میں اس سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی، میں گھبرا گیا، بھیا جلدی واپس آگئے، اب کیا ہوگا، میں جیسے بھی ہو سکا الٹا سیدھا کیمرہ بند کیا اور محراب میں رکھ کر اسی طرح دروازہ بند کر کے واپس آگیا، دیکھا تو باہر چھوٹی بہن طاہرہ کھڑی تھی، کچھ دیر بعد بھیا بھی آگئے۔ آتے ہی انھوں نے سب بچوں کو حوض کے پاس ترتیب سے کھڑا کیا اور اپنا کیمرہ لینے کمرے میں گئے — جس وقت وہ کمرے سے باہر نکلے ہیں ان کی صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ غصے میں بھرے ہوئے تھے، منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے انھوں نے چیختے ہوئے کہا، میرے کمرے میں کون گیا تھا؟ — کچھ بچے حوض کے پاس کھڑے بھیا کا انتظار کر رہے تھے

اور کچھ ایک دوسرے کو اپنے کپڑے دکھا کر خوش ہو رہے تھے، بھیا کی آواز پر سب چونک پڑے، سب نے ایک زبان ہو کر کہا، نہیں بھیا ہم نہیں گئے ـــ پھر کون آیا تھا؟ ـ بھیا نے کہا۔ طاہرہ میری طرف دیکھنے لگی، میں گھبرا گیا، میں نے اسے چپ رہنے کے لاکھ اشارے کیے مگر اس نے کہہ ہی دیا، شوکت بھیا ابھی آپ کے کمرے میں گئے تھے، ان کے سوا اور کوئی نہیں گیا ـــ وہ غصے سے چیختے ہوئے میری طرف بڑھے، اس کے بعد میرا کان ان کے ہاتھ میں تھا، اور میرے گال تھپڑوں سے لال ہو رہے تھے ـــ وہ کہہ رہے تھے، نالائق نے سارے کا سارا فلم خراب کر دیا، اب کیا خاک تصویر لی جائے گی ـ میں اپنے کمرے میں آکر رونے لگا اب مجھے اپنے پاس کیمرہ نہ ہونے کا سخت افسوس تھا، اگر میرے پاس کیمرہ ہوتا تو کہتا لیجیے حضرت ذرا ہاتھ لگانے پر آپ کا کیمرہ خراب ہو گیا، میرا کیمرہ لے لیجیے۔ فرماتے ہیں ہم تصویر نہ لیں گے اگر میرا کیمرہ ہوتا تو کہتا، بس رہنے دیجیے، اگر آپ تصویر نہیں لیتے نہ لیں ہم لیں گے ـــ" یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ ذرا سا کیمرہ کھولنے پر کس طرح ان کا سارا فلم خراب ہو گیا اور میں یہی سمجھتا تھا کہ انھوں نے تصویر نہ لینے کے لیے ہمیشہ کی طرح کوئی بہانہ بنایا ہے ـــ ہر شخص مجھے برا بھلا کہتا تھا، اور ہر ایک کی زبان پر یہی فقرہ تھا کہ تمھیں کیا پڑی تھی جو ان کا کیمرہ کھول بیٹھے۔ اب تو میں نے دل میں ٹھان لی کہ ایک کیمرہ ضرور لوں گا، پھر تو بھیا کی ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔ ہم جب چاہے تصویر لیں گے، سب بچے ہمیں عزیز رکھیں گے، ہم ان کی تصویر لیں گے ہم اپنے دوست اظہار کی بھی تصویر لیں گے وہ بھی ہماری تصویر لے گا اور ہم دونوں اپنی تصویریں دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے بس اب ایک کیمرہ کی ضرورت ہے، کھٹکا دبایا اور پھر تصویریں ہی تصویریں ـــ" کیمرہ تو ہم خرید لیتے مگر سخن دریں است والا معاملہ تھا پیسے کس کے پاس، یہ ہیں تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں، اب میں نے پیسے جمع کرنا شروع کر دیا۔ ہر روز دیکھتا جاتا تھا کہ پونجی کس درجے پر پہنچی ـ ایک دن ابا دفتر سے آتے ہوئے رسالہ کامیاب لیتے آئے۔ یہ دہلی سے نکلتا تھا، میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، دو چار مضامین پڑھے، اس کے بعد صفحہ الٹتے ہی میری نظر جم کر رہ گئی، پورے صفحے پر ایک خوش نما کیمرے کی تصویر تھی، میں نے اشتہار دیکھا، لکھا تھا نہایت اچھا فوٹو کھینچتا ہے، اس کے ساتھ فوٹو کھینچنے کا تمام سامان مفت دیا جائے گا، اس قسم کے کیمرے دس پندرہ روپیے سے کم میں نہ ملتے تھے، مگر اب جاپان کی حیرت انگیز ایجاد کی وجہ سے یہ کیمرہ تمام سامان کے ساتھ صرف دو روپیے چار آنے میں ملے گا جلدی کیجیے کہیں اسٹاک ختم نہ ہو جائے۔ سات آنے محصول خرچ ہوگا صرف ایک خط لکھ دیجیے ہم بہ ذریعہ وی۔ پی کیمرہ بھیج دیں گے" مینجر رسالہ کامیاب، میں خوشی سے چلا اٹھا، صرف دو روپے چار آنے میں کیمرہ سستا، بہت سستا۔ بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا، جلدی جلدی پیسے گنے مگر آہ! وہ صرف ڈیڑھ روپیے کے پیسے تھے۔ کاش دو روپیے گیارہ آنے ہوتے۔ میں کسی سے مانگنا بھی نہ چاہتا تھا، میں چاہتا تھا کہ گھر والوں کو کیمرے کے متعلق کسی قسم کی خبر نہ ہو، وہ اسے یکایک دیکھیں اور حیرت میں رہ جائیں ـ سوچتے سوچتے مجھے اظہار کا خیال آیا، وہ میرا عزیز دوست تھا، اور قریب ہی رہتا تھا، اس کے پاس ہر وقت کچھ نہ کچھ پیسے ضرور رہتے تھے، میں اسی وقت رسالہ لیے ہوئے اظہار کے پاس پہنچا، خوش قسمتی کہیے یا بد قسمتی وہ گھر ہی پر تھا، جونھی اس نے اشتہار پڑھا خوش ہو گیا، کہنے لگا پندرہ روپیے کا کیمرہ دو روپیے چار آنے میں، ارزانی کی حد ہو گئی، میں نے اسے بتایا کہ میرا ارادہ کیمرہ منگانے کا ہے اور اس کے لیے اس کی امداد کی ضرورت ہے کچھ

دیر تک وہ ٹال مٹول کرتا رہا، مگر آخر راضی ہو گیا۔ خط بھیج دیا گیا، اور کیمرے کا انتظار کیا جانے لگا۔ ایک دن میں نے فرحت بھیا کو رسالہ کامیاب دکھایا، اور ساتھ ہی رُکتے رُکتے یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے کیمرہ منگایا ہے۔ یہ سُنتے ہی کہنے لگے "شوکت تم نے بغیر کسی سے کچھ سُنے کیمرے کے لیے لکھ دیا؟ کسی سے پوچھا تو ہوتا، یہ اشتہاری بڑے دھوکے باز ہوتے ہیں، لکھتے کچھ اور ہیں بھیجتے کچھ اور۔ اب کون تھوڑی رقم کے لیے اتنی دُور جائے گا اور لڑے گا۔" ساتھ ہی انھوں نے اپنے ایک دوست کا قصہ سُنایا جنھوں نے گھڑیاں منگا کر کافی نقصان اُٹھایا تھا۔ "اب بھی وقت ہے،" وہ کہہ رہے تھے، "وی پی آئے تو واپس کر دو، کچھ دن ٹھیر جاؤ تو ہم خود تمھیں کوئی اچھا سا کیمرہ دلا دیں گے، اس کے کم داموں پر مت جاؤ، یہ صریحاً دھوکا ہے۔" فرحت بھیا نے سمجھایا مگر میں نے نہ مانا، اُن کے سامنے تو ہاں ہاں ٹھیک ہے کہا گیا مگر دل میں بے چینی سے کیمرے کا انتظار کرنے لگا۔ آخر اطلاعی فارم آیا، اور دوسرے ہی روز کیمرہ بھی آ پہنچا۔ ایک بڑا سا بنڈل تھا، میں نے اظہار کو بلایا، ہم نے خوشی خوشی اسے وصول کیا، کھولا تو ایک چوکور لکڑی کے ڈبے میں جو کاغذوں سے بھرا ہوا تھا، ایک کونے میں ایک چھوٹا سا ڈبہ رکھا تھا، ایک سیاہ لفافے پر دو شیشیاں رکھی تھیں، چھوٹا سا ڈبہ ہی کیمرہ تھا۔ ہمارا دل بیٹھ گیا۔ ڈبہ ہاتھ سے چھوٹ گیا، تصویر اور اس میں کوئی مطابقت نہ تھی۔ سیاہ لفافہ کھولا، ایک سیلولائیڈ کا ٹکڑا نکلا مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ایک ہرا سا انگریزی پرچہ بھی تھا جسے میں اور اظہار دونوں میں سے کوئی بھی اچھی طرح نہ پڑھ سکتا تھا۔ حیران، پریشان میں اظہار کی اور اظہار میری صورت تکتے تھے۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی کیمرہ ہے جو کامیاب کے صفحے کی زینت تھا۔ کیا یہ وہی ہے جس کی قیمت پندرہ روپیے تھی۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ فرحت بھیا کا کہنا سچ تھا۔ ہم دل ہی دل میں کامیاب کے منیجر کو صلواتیں سُنا رہے تھے۔ کسی سے کچھ کہہ سُن کر دل کی بھڑاس بھی نکال نہ سکتے تھے، کیوں کہ سب ہمیں کو باتیں کرتے۔ کسی سے رائے نہ لی۔ ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ یہ اس کا نتیجہ تھا۔ پیچھے فرحت بھیا کھڑے ہنس رہے تھے۔ ان کی ہنسی نمک مرچ کا کام کر رہی تھی۔ "کیوں ہم نہ کہتے تھے اشتہاری چیزیں قابل بھروسے کے نہیں ہوتیں۔ یہ بھی کوئی کیمرہ ہے؟ فضول بالکل فضول اور یہ ٹکڑا یہ فلم تھا۔ ہاہاہا، تم نے اسے باہر نکال لیا۔ اب یہ کسی کام کا نہیں، اور نہ ہی یہ یہاں مل سکتا ہے۔ اس صورت میں شیشیاں بھی بے کار ہیں۔ اب تمھارے لیے شکایتی خطوط لکھنا بھی بے سود ہے کیوں کہ وہ بغیر دیکھے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے جائیں گے۔ اب رہا یہ کہ اس کے پاس جا کر یہ کہنا کہ دیکھ تو نے لکھا کیا تھا اور بھیجا کیا۔ تو کیا تم دو روپیے گیارہ آنے کی خاطر دہلی جاؤ گے؟"

جو کچھ فرحت بھیا کہہ رہے تھے وہ بالکل صحیح تھا۔ ہم دل ہی دل میں کُڑھ رہے تھے اور بھیا کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کر رہا تھا۔

مرزا اظہر افسر (سال اول)

پیامِ شباب

غمِ زندگانی اُٹھاتا چلا جا
مگر اے جواں مُسکراتا چلا جا

ترا عزم اور اس قدر غیر محکم
پہاڑوں کو پیہم ہلاتا چلا جا

یہ ساحل گزینی تری بزدلی ہے
اب اُٹھ اور طوفاں اُٹھاتا چلا جا

حوادث کی فوجوں سے لڑتا جھگڑتا
دو عالم کی وسعت پہ چھاتا چلا جا

بدلنا ہے تجھ کو نظامِ زمانہ
صداقت کے پرچم اُڑاتا چلا جا

بساطِ اہلِ باطل کی بڑھ کر اُلٹ دے
قیامت کے منظر دکھاتا چلا جا

خداوندیوں کی بنائیں ہلا دے
ہر اک قصر و ایواں کو ڈھاتا چلا جا

سکھا قلبِ فرعون کو خود شناسی
کلیمی کی شانیں دکھاتا چلا جا

ریاکاریوں سے نگاہیں ملا کر
نقابِ حقیقت اُٹھاتا چلا جا

جو مرنے کی خاطر جیے جا رہے ہیں
انھیں رازِ ہستی بتاتا چلا جا

"محبت کی دنیا بسانی ہے تجھ کو"
یہ نغمہ نئی دُھن میں گاتا چلا جا

سلیمان اریب
سابق متعلم

صنعتی انقلاب

صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس کے جیسی کوئی چیز نہیں۔ بلکہ اس سے ملک کی معاشی زندگی کی ایک خاص حالت مراد ہوتی ہے، اس میں نہ نعرہ ہوتا ہے نہ خون وقتل، بلکہ انسان کی خاموش محنت کی بجائے مشین کی دھن دھنائی آواز ہوتی ہے۔

۱۷۵۰ء سے قبل دنیا میں اور خصوصاً یورپ میں پیدائش دولت کے جو طریقے رائج تھے وہ ۱۷۵۰ء کے بعد باقی نہیں رہے، بلکہ اس میں ایک انقلاب ہوگیا اسی کو صنعتی انقلاب یا انقلاب صنایع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب کی بنیاد یہ تھی کہ پہلے جو کام انسانی دست و بازو و انسانی قوت سے کیے جاتے تھے وہ اب مشین سے ہونے لگے۔ انسان کا کام صرف مشین کو چلانا رہ گیا، باقی سارا کام مشین کرنے لگی۔ قبل اس کے کہ اس کی تفصیلات بیان کی جائیں دولت کے مفہوم کو واضح کرنا ضروری ہے۔ معاشیات میں دولت سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کی کسی ضرورت کو پورا کرے۔ قدرت میں بے شمار اشیا خاص خاص حالتوں میں پائی جاتی ہیں۔ بعض میں قدرتی طور پر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ انسانی احتیاج کو پورا کریں بعض میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ وہ انسانی ضرورت کو پورا کریں۔ لکڑی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ جلائی جاسکتی ہے، اس سے انسانی احتیاج آگ، روشنی اور گرمی پوری ہوتی ہے۔ یہ اس کی قدرتی صلاحیت ہے۔ لیکن اگر کوئی بڑھئی لکڑی کے کندے کو لے اور اپنی فنی مہارت اور جدوجہد کو کام میں لاکر چند مفید چیزیں مثلاً میز، کرسی، پلنگ، الماری وغیرہ بنائے تو اس کا یہ کام پیدائش دولت میں شمار ہوگا۔ حالانکہ وہ صرف اشیا میں ایک تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔

صنعتی انقلاب ایک دو دن کی کوشش اور محنت کا نتیجہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے اسباب ایک دو تھے۔ دولت کی پیدائش کا انحصار کئی چیزوں پر ہے۔ قوت محرکہ جس سے کام کیا جاسکے۔ طریق پیدائش، ذرائع حمل و نقل،

ذرایع خبر رسانی، بازار کی وسعت، طرز زندگی وغیرہ، یہ سب چیزیں دولت کی پیدائش پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس لیے صنعتی انقلاب سے فی الحقیقت ذرایع پیدائش دولت میں انقلاب مراد ہوتا ہے اور انھیں ذرایع کا انقلاب دراصل ہماری موجودہ معاشی و معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے۔

قوتِ محرکہ

انسان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں سوائے اپنے دست و بازو کے کسی اور چیز کے استعمال کا اس کو علم نہ تھا۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا اس میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ ڈنڈے۔ بیلن پھر مویشی وغیرہ سے کام لیا جانے لگا۔ اس زمانے میں ان ہی ذرایع سے ایسے نادر کام کیے جاتے تھے کہ انسان آج بھی دنگ ہے۔ اگرچہ قدیم عہد میں قوت محرکہ کا کوئی زبردست ذریعہ موجود نہ تھا، اور نہ ہی اس کا علم تھا لیکن مصریوں نے جو اہرام تعمیر کیے وہ ہر شخص کو حیران کر دیتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سب سے بڑے اہرام کی تیاری میں ڈھائی ڈھائی ٹن وزنی پتھر کو پانسو فیٹ اوپر لے جایا گیا جو اس زمانے کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی متحیرکن ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس ایک اہرام کی تعمیر میں ایک لاکھ انسان مسلسل ساٹھ مہینے کام کرتے رہے ہونگے۔ وزنی پتھروں کو منتقل کرنے میں مصریوں نے جس چیز کا پہلے استعمال کیا تھا وہ بیلن تھے جس کو پتھر کے نیچے رکھ کر پتھر کو لڑھکا دیا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ سطح کو ڈھلوان بنانا ہے۔ اس کے بعد بیرم سے امداد لی گئی جس میں معمولی انسانی قوت سے بڑے بڑے وزن اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ بیرم کے بعد ہی چرخی کا استعمال شروع ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں اسی مدت میں اور اتنی ہی محنت سے اس اہرام جیسی ستر اسی عمارات تیار کی جا سکتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے کام کرنے کے طریقوں میں انسانی محنت کی بجائے علم و حکمت کا بڑا حصہ ہے۔ سنہ ۱۶۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک سائنس کی ترقی کے ساتھ قوت محرکہ میں بھی تبدیلی ہوتی گئی اور یہ تبدیلی بالکل سائنس کی ترقی کے تابع تھی۔ کوئلہ۔ تیل اور پانی پہلے بھی موجود تھے لیکن ان سے کام لینا جس نے سکھایا وہ سائنس ہے۔ ذرایع آمد و رفت، قوت محرکہ کا حصول وغیرہ ان ہی تین چیزوں کے استعمال پر موقوف تھا۔

ابتداً سورج کی گرمی، سمندر کے مد و جزر۔ جمے ہوئے پانی وغیرہ سے مشین چلانے کی ناکام کوشش کی گئی لیکن مسلسل کوشش اور تجربے کے بعد جن چیزوں سے مشین چلانے کا کام لیا گیا وہ بھاپ، گیس، اور بجلی ہیں۔

سنہ ۱۷۰۰ء سے قبل تک بھاپ سے کام لینا کسی کو نہ آیا۔ اگرچہ سنہ ۱۶۵۰ء میں اسکندریہ کے ایک سائنس داں ہیرو نے بھاپ کی ایک گیند بنائی تھی لیکن یہ محض کھلونا تھی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ

بھاپ سے کام لینے کی ابتدا اسی گنبد سے ہوئی۔ اس کے بعد صدیوں تک کوئی کوشش بارآور نہیں ہوئی۔ آج سے تین سو سال قبل اٹلی کے ایک باشندے نے جس کا نام برآن کا تھا ایک عجیب انجن بنایا۔ یہ ایک مجسمہ تھا اس کے منہ میں ایک نلی تھی اس نلی میں سے بھاپ نکلتی اور دندانہ دار پہیئے سے ٹکرا کر اس کو حرکت دیتی تھی۔ اس طرح سے قوت محرکہ حاصل کی گئی سترھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں پیپن نامی شخص نے ایک اور مشین بنائی جس میں سلنڈر کے ذریعے سے حرکت پیدا کی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ طریقہ ناقص تھا مگر یہ تو معلوم ہو گیا کہ بھاپ کو سلنڈر میں بند کیا جا سکتا ہے اور پھر اس سے حسب مرضی کام لیا جا سکتا ہے۔

سولھویں صدی اور سترھویں صدی عیسوی میں کوئلہ بہت زیادہ نکالا جانے لگا اور جب کانوں میں پانی بھر جاتا تو اس کے نکالنے میں بڑی دقت ہونے لگی اس لیے کان کے مالکوں نے اعلان شایع کیے کہ اُس شخص کو بھاری انعام دیا جائے گا جو پانی کو نکالنے والا بھاری اور عمدہ پمپ ایجاد کرے۔ اس کوشش کرنے والوں میں نیوکومین نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی۔ اس کا تیار کردہ پمپ بہت مفید ثابت ہوا، لیکن جب وہ بگڑ گیا اور درستی کے لیے جیمس واٹ نامی لوہار کے پاس لایا گیا تو اس نے اس کا بہ غور مطالعہ کیا اور درست کر دینے کے بعد ہی اپنے طور پر اس سے زیادہ مفید مشین کی تیاری شروع کی! اس کا انجن جب تیار ہوا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ اب انجن انسان کے استعمال کے قابل ہوئے ہیں! اس کے انجن کو بنیاد بنا کر آج کل کے سارے انجن بنائے گئے ہیں جو ہماری ضروریات زندگی اور تہذیب کا بڑا بھاری عنصر ہیں! اس کے ...... بعد ہی اس انجن کو ریل اور کشتیوں میں استعمال کرنے کے متعلق مختلف تجربے کیے گئے اور اس میں کامیابی ہو تی گئی۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا ان مشینوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور آخر کار انھوں نے ریل اور جہاز کی شکل اختیار کر لی۔

بھاپ کی طرح اور گیسوں سے بھی اس قسم کے کام لینے کے لیے تجربے کیے گئے اور تجربوں سے یہ بات واضح ہوئی کہ بعض گیسیں ایسی ہیں جن کی قوت پانی سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں سے ایک گیسولین ہے۔ گیسولین جب گرم کی جاتی ہے تو گیس بن جاتی ہے اور جب اس میں ذرا سی چنگاری پہنچائی جاتی ہے تو بھک سے جل جاتی ہے۔ جس وقت یہ جلتی ہے تو بہت زیادہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ بھاپ کی بہ نسبت گیس کے انجنوں کا وزن اور حجم بہت کم ہوتا ہے کیونکہ بھاپ کے انجن میں پانی کے ذخیرے کو بھاپ بنانے اور پھر اس سے کام لینے کے لیے گنجایش ہونی چاہیے۔ گیس کے انجن میں اس قدر زیادہ گنجایش کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تیسرا اور سب سے اہم و مقبول ذریعہ بجلی ہے جس سے قوت محرکہ حاصل کی جا سکتی ہے میکائیل فراڈے نے ۱۸۳۱ء میں اس بات کو معلوم کیا کہ اگر تار کو مقناطیس کے اوپر آگے اور پیچھے حرکت دی جائے تو اس میں برق پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مسلسل تجربے کیے گئے، اور آخر یہ معلوم کیا گیا کہ اگر ایک نلی کے گرد بہت سے تار لپیٹ دیے جائیں اور اس کو مقناطیس کے اندر تیزی سے گھمایا جائے تو برقی رو حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اگر تانبے کے تاروں کو باہر بھی لپیٹا جائے تو اس کی مدد سے برقی رو کو دور بھی لے جایا جا سکتا ہے۔ اب بجلی گویا کہ انسان کی غلام ہو گئی تھی۔ ہر طرح کے کام حتیٰ کہ گھر کی جھاڑو اور صفائی بھی بجلی کی مدد سے ہونے لگی۔ مشینوں کا چلانا۔ ریل۔ موٹر۔ ٹرام۔ روشنی۔ پنکھے وغیرہ اس سے چلائے جانے لگے۔ غرض کہ ہر کام بجلی سے لینے کی کوشش ہو رہی ہے اور اس میں بہت کچھ ترقی ہو گئی۔ ذرائع حمل و نقل کی ترقی اور ذرائع خبر رسانی کی موجودہ ترقی یافتہ شکل بجلی ہی کا کرشمہ ہے۔ بجلی کی وجہ سے صنعت میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور جو کام ہزاروں انسان مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے بجلی کے ایک بٹن کے دبانے سے ہو رہے ہیں۔ گویا کہ آج کل کی تہذیب اور صنعت کی ترقی کا دار و مدار بجلی پر ہے۔ اگر بجلی کو ہماری زندگی میں سے نکال لیا جائے تو معلوم نہیں ہمارا کیا حال ہو۔

طریق پیدائش دولت

پیدائش دولت کا سب سے پہلا اور اہم ذریعہ زراعت ہے۔ دوسرے سارے ذرائع پیدائش دولت زراعت کے تابع ہیں۔ زراعت سے ہم کو خام اشیا اور غلہ حاصل ہوتا ہے۔ غلے کے بعد جو چیز اہم ہے اور جس پر موجودہ تہذیب کا انحصار ہے وہ خام اشیا ہیں۔ اگر یہ خام اشیا مہیا نہ ہو سکیں تو صنعت ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ کہنا سراسر نادانی ہے کہ زراعت ناقص پیشہ ہے۔ اگر زراعت کو ناقص قرار دے کر اس کو ترک کر دیا جائے تو دنیا بھی گردش کرتے ہوئے رک جائے گی۔ لیکن اگر طریقے میں نقص ہو تو پھر زراعت ہی کیا ہر شعبہ پیدائش دولت کا نقص تباہ کن ہوتا ہے۔

صنعتی انقلاب سے قبل انگلستان میں بہت سی اراضیات ایسی تھیں جو دیہات کے عام لوگوں کے مویشی کے لیے وقف تھیں۔ ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے مویشی ان زمینوں پر چرائے۔ لیکن جوں جوں زمانہ بدلتا گیا زمیں دار اور جاگیردار ان زمینات پر قبضہ کرتے گئے اور غریب دیہاتیوں کو بے دخل کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ ساری زمینات کسانوں سے چھین لی گئیں اور زمیں دار یا تو اس پر مویشی رکھنے یا زراعت کراتے تھے۔ اس زمانے میں زراعت سے بڑھ کر مویشی کی اہمیت تھی کیونکہ دودھ مسکہ اور ان سے بھی بڑھ کر اون کی کافی قیمت حاصل ہو جاتی تھی اور اس کے لیے زمیں داروں کو زیادہ خرچ کرنے اور زیادہ محنت صرف کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح سے جب وہ کسان جو مویشی کی مدد سے زندگی

بسر کر رہے تھے، بے سہارا ہوگئے تو انھوں نے شہروں کا رُخ کیا۔ شہروں میں اسی زمانے میں نئے نئے کارخانے قائم ہو رہے تھے اور مزدوروں کی ضرورت تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ کاشت کاری سے نکل کر صنعتی مزدور بن گئے اور انگلستان کی آبادی کا بڑا حصہ صنعتی مزدور ہو گیا۔

دوسری طرف ایسے زمیں دار جو اپنی زمینوں پر زراعت کروانا چاہتے تھے ایسے مزدوروں یا کسانوں کے متلاشی تھے جو اُجرت پر دلچسپی اور شوق سے کام کریں۔ جب عام طور پر کسان تبدیل پیشہ پر مجبور ہوئے اور پھر زمیں داروں کو کسانوں کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے اس مجمع کثیر سے بہتر اشخاص کا انتخاب کر لیا اور ان لوگوں نے اپنے آبائی پیشے کو کم اُجرت ہی پر قبول کر لیا۔ اس طرح زمیں داروں کی یہ مشکل حل ہوگئی کہ عمدہ اور موزوں اشخاص ملیں۔ اس کے بعد شہروں میں لوگ مسلسل غور و فکر میں مشغول تھے۔ نیز زمیں دار خود اس بات میں کوشاں تھے کہ زراعت میں جو نقایص ہیں وہ دُور ہوں، اس لیے انھوں نے ایسے اشخاص کی مالی امداد اور سرپرستی کی جو زراعت کے نقایص دُور کرنے کی تدابیر پر غور کر سکتے تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم طریقۂ زراعت یکسر بدل گیا۔ اب کھیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل کر بڑے بڑے کھیت بن گئے تھے۔ جب ان مفکروں نے لکڑی وغیرہ کے ناقص آلات زرعی کے بدلے میں لوہے کے پائدار آلات ایجاد کیے تو ان زمیں داروں نے اس کو استعمال کیا۔ استعمال کے دوران میں یہ معلوم ہوا کہ مویشی ان آلات کو آسانی کے ساتھ کام میں لا سکتے ہیں تو پھر غور و فکر کا دروازہ کھلا۔ قوت محرکہ میں عظیم ترین تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں اس لیے انھوں نے اسی میں سے تیل اور بھاپ کے انجنوں کو ان آلات کے حرکت میں لانے کے لیے منتخب کیا اور مشین استعمال کیے جانے لگے۔ مشین مویشی کی نسبت بہت زیادہ کام بہت کم وقت میں کرتے تھے اور چونکہ یہ زمیں دار کافی مال دار بھی تھے اس لیے ان کو ان آلات کے استعمال میں کسی قسم کی دشواری نہیں تھی۔ اس کے بعد جو اہم مسئلہ تھا وہ کھاد اور آب رسانی کا تھا۔ کھاد کے مسئلے کو تو کیمیا جاننے والوں نے بہتر طریقے پر حل کر دیا۔ ہر پودے اور ہر تخم کا تجزیہ کیا گیا۔ ہر زمین کو جانچا گیا۔ اب یہ آسان تھا کہ کونسی شے کس زمین پر اُگائی جا سکتی ہے۔ کس زمین پر کس تخم کے لیے کس قسم کی کھاد ضروری ہے۔ یہ فن یورپ میں اس قدر ترقی کر گیا کہ آج ایک کسان گھر بیٹھ کر کسی کھاد کی کمپنی کو اپنے تخم اور اپنی زمین کی کچھ مٹی مقررہ فیس کے ساتھ روانہ کرتا ہے اور ان سے مشورہ طلب کرتا ہے کہ اس تخم کو اس زمین میں بونے کے بعد کس قسم کی کھاد دی جائے۔ یہ کمپنیاں کھیتوں سے میلوں دُور رہ کر بھی روانہ کردہ تخم اور زمین کی جانچ کے بعد کھاد کا نسخہ لکھ دیتی ہیں اور کسان زمین سے سونا اگلواتے ہیں۔

قوت محرکہ میں انقلاب اور اس کے بعد زراعت بڑے پیمانے پر اس بات کی متقاضی ہوئی کہ وہ کاروبار

اور صنعتیں جو آج تک معمولی طور پر چلائی جا رہی تھیں۔ اب وسیع کر دی جائیں مشین کا استعمال اور پھر کھاد کا اصولی استعمال بہتر خام پیداوار مہیا کر رہا تھا، اس لیے اب صنعت کو بھی پیمانۂ کبیر پر لایا گیا۔ وہ مقامات جو اب تک معمولی آبادی رکھتے تھے اب بڑے بڑے شہر بننے لگے۔ لندن کی آبادی سنہ ۱۵۰۰ء میں پچاس ہزار تھی۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں پانچ لاکھ ہوگئی۔ اب وہ کسان جو پہلے اپنے کھیت کے حدود میں محصور تھا، آزاد ہو کر شہروں کے کارخانوں میں مقید ہوگیا۔ اب وہ عامل پیدائش کی حیثیت کھو کر محض معمولی مزدور بن گیا جس کی روزی کا دار و مدار مالک کارخانہ کی مرضی پر تھا۔

وہ ساری گھریلو صنعتیں تباہ ہوگئیں جو کسان اپنے بے کاری کے اوقات گذارنے اور معاش پیدا کرنے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ گھریلو صنعتیں اب بڑے بڑے کارخانوں کی بھینٹ چڑھا دی گئی تھیں۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں انگلستان کا قوت محرکہ میں انقلاب ہوا، اور معلوم ہوا کہ انسانی دست و بازو سے کہیں زیادہ عمدگی، صفائی اور عجلت سے مشین کام کر سکتی ہے تو اُن سرمایہ داروں نے جو خام اشیا پیدا کرتے یا آسانی سے حاصل کر سکتے تھے فوراً بڑے بڑے کارخانے کھول دیے۔ کسان تو دیہات چھوڑ ہی رہے تھے اس لیے اب انھوں نے کارخانوں میں مزدور کی جگہ حاصل کر لی۔ سنہ ۱۷۶۴ء میں کاتنے کی مشین اور سنہ ۱۷۳۲ء میں بنائی وغیرہ کی مشینیں دریافت ہو چکی تھیں، اور جب دخانی انجن کی سنہ ۱۷۶۰ء میں اصلاح ہوئی تو اسی اصول کو انتقال کر کے سنہ ۱۷۶۶ء میں ایک بھدی کپڑا بننے کی مشین بنائی گئی۔ سنہ ۱۷۸۵ء میں پانی سے قوت حاصل کر کے اس مشین کو کچھ درست کیا گیا۔ لیکن ان ترمیمات اور تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد ایک مکمل اور کافی سہل مشین تیار ہوگئی اور اب مزدور بجائے کپڑا بننے کے صرف کپڑا بنتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس کا کام صرف مشین کو حرکت میں لانا، اس کی دیکھ بھال اور اس کی صفائی رہ گیا۔ باقی سارا کام خود مشین کر لیتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کپڑا زیادہ مقدار میں، کم مدت میں اور کم صرفہ سے عمدہ اور نفیس حاصل ہونے لگا۔

گویا کہ اس انقلاب کا صنعت پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ وہ کام جو گھر میں چند گنتی کے افراد معمولی سرمایہ اور معمولی آلات سے انجام دیتے تھے اب فیکٹری میں زیادہ ۔۔۔ مزدوروں سے کثیر سرمایہ اور بڑی بڑی مشینوں سے ہونے لگا۔ پیمانۂ صغیر کے بدلے پیمانۂ کبیر پر پیدائش ہونے لگی۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ وہ لوگ جو پہلے گھر پر اپنے طور پر کام کرتے تھے اب وہ فیکٹری میں اجرت پر کام کرنے لگے۔ اب وہ اس قدر آزاد اور اپنی مرضی کے مالک نہ تھے بلکہ اب ان کو ایک نگران کے اشارہ پر کام کرنا پڑتا تھا اور اس سے بڑھ کر اس کو راضی رکھنا پڑتا تھا۔ اس کی ناراضی صاف معنوں میں فاقہ کشی کا دروازہ کھول دیتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام دلچسپی سے ہونے کی بجائے خوف اور ڈر سے

ہونے لگا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہر کام بڑے پیمانے پر ہونے لگا۔ روئی۔ ریشم۔ کوئلہ۔ لوہا۔ مشین غرض کہ ہر چیز بڑے پیمانے پر حاصل اور تیار ہونے لگی۔ اور چونکہ یہ ایسے کاروبار تھے جن کو صرف سرمایہ دار ہی چلا سکتے تھے اور معمولی سرمایہ رکھنے والے ادھر قدم نہیں بڑھا سکتے تھے اس لیے یہیں سے اس دور کا آغاز ہوتا ہے جس کو "اصل شاہی دور" کہا جاتا ہے۔ اب سارا کاروبار سرمایے کے تحت اور تابع ہے۔

ذرایع حمل و نقل اور خبر رسانی

قدیم ترین ذریعۂ نقل و حمل خود انسان کی ذات تھی۔ اس کے اعصاب، اس کی کمر، اس کی گردن بوجھ اٹھاتی تھی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی تھی۔ اس حالت میں ایک مدت بسر کرنے کے بعد انسان یہ کام مویشی سے لینے لگا، اور جب اس کو مویشی پر کامل قدرت حاصل ہو گئی تو ان سے بڑے بڑے کام لینے لگا۔ انسان ایک معین وزن سے زاید نہیں اٹھا سکتا تھا، مویشی اس سے کئی گنا زاید وزن اٹھا سکتے تھے۔ انسان بہت جلد تھک جاتا لیکن مویشی نسبتاً زیادہ دیر میں تھکتے تھے۔ ہندوستان کے ہاتھی۔ عرب کے اونٹ اور گھوڑے، بحیرۂ روم کے ملکوں میں خچر وغیرہ سب اسی کام کے لیے استعمال ہونے لگے اور ایک طویل زمانے تک حمل و نقل کا دار و مدار مویشیوں پر رہا۔ لیکن ان مویشیوں پر زیادہ مال لادا نہیں جا سکتا تھا، اور پھر بڑی دقت یہ تھی کہ مویشی پر سامان لادنے میں توازن کا بہت خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے اب پہیّے کا استعمال شروع ہوا۔ تاریخ سے یہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا کہ سب سے پہلے مصر نے پہیّے کا استعمال کیا، یا ہندوستان نے، لیکن یہ یقینی ہے کہ ان ہی دو ملکوں نے پہیّے کو استعمال کیا، اور اس کو ترقی دی۔ اس کے ساتھ ہی بیل گاڑی وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہیّے کی دریافت کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ دنیا کے ترقی یافتہ ذرایع حمل و نقل کا انحصار ان ہی پہیّوں پر ہے۔ ہندوستانی اور اس کو جہالت کا خطاب دینے والے آج اپنے ذرایع حمل و نقل سے پہیّے نکال دیں اور دیکھیں کہ کیا ان کے کاروبار اس ترقی یافتہ حالت میں رہ سکتے ہیں۔ آج تک پہیّے سے زیادہ مفید چیز دریافت نہیں ہو سکی اور نہ ہی دریافت ہونے کی توقع ہے۔ بہرحال یہیں سے پہیّے کی ابتدا ہوئی اور اس کی بھدی شکل آج کل بھی ہماری بیل گاڑیوں میں نظر آتی ہے۔ اس پر زیادہ سامان لادا جاتا ہے اور ایک وقت میں ایک سے زیادہ مویشیوں کی قوت سے کام لیا جا سکتا ہے۔ پہلے پہل بیل سے یہ کام لیا گیا، اگرچہ وہ ایک مضبوط جانور تھا لیکن سست رفتار تھا اس لیے دوسرے تیز رفتار جانور گھوڑے خچر وغیرہ استعمال ہونے لگے۔ یہ حالت ۱۷۷۰ء تک قایم رہی جب یورپ میں قوت محرکہ میں انقلاب ہوا تو غور کرنے والوں نے غور کر کے اسی بیل گاڑی سے بیل کو خارج کر کے گاڑی تو رکھی لیکن بیل کی بجائے مشین لگا دی۔ اب یہ "مشین گاڑی" بیل گاڑی سے کہیں زیادہ وزن کھینچ سکتی تھی، کہیں زیادہ تیز رفتار سے

فاصلہ طے کر سکتی تھی اور طرفہ یہ کہ دن رات کام کر سکتی تھی، نہ تھکتی تھی اور نہ دانہ پانی کے لیے ٹھیرتی تھی۔ گھوڑوں کی مدد سے پانچ میل فی گھنٹہ کے حساب سے ایک دن میں صرف چالیس میل سامان لایا جاسکتا تھا، لیکن آج اس کی ترقی یافتہ شکل ریل اور موٹر چالیس میل سے سو میل فی گھنٹہ تک کے حساب سے بے حساب وزن لے جایا جاسکتا ہے اور پھر اس کے لیے ایک سے لے کر چھ آدمی کافی ہیں یہ چھ آدمی اپنی قوت سے بیس ہزار گنا زیادہ وزن لے جاسکتے ہیں۔

ان ذرائع کی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں عام طور پر عمدہ سڑکیں تعمیر ہوگئیں۔ قومی و ملکی ترقی کا بہت کچھ دار و مدار بھی اچھے ذرائع حمل و نقل اور عمدہ سڑکوں پر ہے۔

ریلوے پٹری کا استعمال اگرچہ معدنی علاقوں میں انگلستان میں بہت پہلے شروع ہو چکا تھا لیکن اس میں قوت محرکہ یا تو انسانی تھی یا مویشی کی، لیکن جب ۱۸۲۵ء میں جان اسٹیفن سن نے اپنا دخانی انجن استعمال کیا تو ہر طرف سے اس پر صدائے تحسین بلند ہوئی اور حوصلہ مند انجینیر اس انجن کو ترقی دینے میں مشغول ہو گئے اور چار سال تک کئی انجینیروں نے شرطیں جیتنے کے خیال سے بہتر سے بہتر مشین بنانے کی کوشش کی۔ انگلستان میں ان چار سال میں کئی مقابلے ہوئے کہ کون زیادہ اچھا انجن بناتا ہے۔ ان مقابلوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بنیادی اصول معلوم ہو گیا جس پر ہماری طوفان میل اور پنجاب میل ریل گاڑیوں کی بنیاد ہے۔

ریل کے بعد دوسرا ذریعہ اندرون ملک آمد و رفت نیز رسل و رسایل کا دریا اور نہریں تھے دریا قدرتی تھے اور یہ کہیں مسطح میدان پر سے گذرتے تو کہیں عظیم تر آبشار بناتے تھے۔ کہیں ان میں چٹانیں پوشیدہ تھیں تو کہیں غار بھی غرق آب تھے، اس لیے یہ زیادہ محفوظ نہیں تھے، پھر بھی ان کا ہموار حصہ ضرور اس غرض کے لیے استعمال ہوتا رہا اور چپو سے چلنے والی، بادبان سے چلنے والی اور پھر بھاپ سے چلنے والی کشتیاں ان میں سامان اور مسافر لیے ادھر ادھر پھرا کرتی تھیں اس کے علاوہ یہ دریا ایک خاص مقام سے نکل کر ایک خاص مقام پر ختم ہو جاتے تھے۔ یہ مقامات انسانی ضرورت کے عین مطابق نہیں ہوتے تھے، شاذ ہی ایسے دریا پوری طرح قابل استفادہ ہوتے تھے گنگا کے ذریعے ان مقاموں کو کشتی کے ذریعے سفر ہو سکتا ہے جو اس کے کنارے ہیں لیکن وہ مقامات جو گنگا سے پرے ہیں کشتی کی پہنچ سے دور تھے اس لیے مصنوعی طور پر دریاؤں کو نکالا گیا۔ ان دریاؤں کو جنھیں ہم نہر کہتے ہیں خاص انسانی ضروریات کے تحت بنایا گیا وہ ان مقامات پر سے گذرتی ہیں جو انسان کی ضرورت کے ہوں۔ پھر ان کا بہاؤ انسان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی گہرائی انسان کے

حافظے میں محفوظ تھی۔ غرض کہ اس مصنوعی ذریعے کو دریاؤں کے بدل کے طور پر استعمال کیا جانے لگا اور ان نہروں پر اوسط درجے کے جہاز حمل و نقل کا کام انجام دینے لگے۔

اب دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے کے لیے سمندری جہازوں کی ضرورت تھی۔ جوں جوں قوت محرکہ کو آسانی اور فراوانی سے حاصل کیا جانے لگا اور مشینوں میں طرح طرح کی ترمیمیں ہونے لگیں اسی طرح جہازوں کو محفوظ اور تیز سفر کرنے والا بنایا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ یہ جہاز اچھے خاصے اوسط درجے کے شہر بن گئے جن میں سیرگاہیں بھی ہیں کھیل کے میدان بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک محفوظ قلعہ بھی ہیں۔ دشمن کی تباہی، دوست کی امداد، مسافر اور فوج کی آمد و رفت، رسد کی فراہمی، مصنوعات کو دُور دُور لے جانا، خام اشیا کو دُور دُور سے جمع کرنا، غرض سارے کام ان کے سپرد ہوئے۔ دنیا میں وہی ممالک کافی طاقتور اور دولت مند سمجھے جانے لگے جو عظیم تر بحری بیڑہ رکھتے ہوں اور جن کے قبضے میں سمندر کے راستے ہوں۔

اس سلسلے میں ہوائی جہاز بھی ہیں، لیکن تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ سامان کی نقل و حمل کی حد تک یہ ایک ناکام ذریعہ ہے اس کی یہ دولت بہت کثیر وزن آسانی سے نہیں منتقل کیا جا سکتا لیکن پھر بھی فوری اور اچانک ضرورت کے تحت غلّہ اور مصنوعات یا دوسری قسم کی امداد ضرور اس سے بہت جلد پہنچائی جا سکتی ہے۔ لیکن سمندری جہاز کے مقابلے میں یہ ذریعہ ناکام رہا۔ البتہ مسافروں اور ڈاک کے لیے ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ یہ جہاز سمندری جہاز کے مقابلے میں کئی گنے تیز رفتار ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے راستے جامٹری کے اصول کے مطابق خط مستقیم پر ہیں۔ اس لیے یہ آسانی سے زیادہ فاصلہ کم وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ لیکن زیادہ مال لے جانا ان کے بس کی بات نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ذریعہ سمندری جہاز کے مقابلے میں بہت قیمتی بھی ہے۔

ذرایع خبر رسانی کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ پہلے جو بات برسوں میں معلوم نہیں ہو سکتی تھی اب منٹوں میں معلوم ہو جاتی ہے۔ ڈاک کے لیے بہ تدریج انسان، مویشی، موٹر، ریل، جہاز، ہوائی جہاز اور خبروں کے لیے ٹیلیفون اور تار اور ان سب سے بڑھ کر لاسلکی کا مرہون منت ہے۔ دنیا کی مفید ترین ایجاد اگر کوئی ہو سکتی ہے تو برقی قوت کے بعد لاسلکی ہی ہے۔

بازار کی وسعت

بازار سے مراد وہ علاقہ یا حصہ ہے جہاں کسی چیز کی مانگ ہو اور جہاں تک کسی چیز کو پہنچایا جا سکتا ہو۔ قوت محرکہ اور ذرایع حمل و نقل کی ترقی سے قبل بازار بہت محدود تھے۔ اشیا زیادہ تر ایک ہی مقام پر رہتیں۔ یا اگر سوداگروں کے قافلے نکلیں تو اندرون ملک تجارت ہوتی تھی لیکن یہ تجارت نقل و حمل کے ناقص ذرایع اور راستوں کے

غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے پُر خطر تھی۔ قافلے کی واپسی تک یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ آیا قافلہ کامیابی سے واپس ہوگا یا کم سے کم سوداگر ہی اپنی جانیں سلامت واپس لا سکیں گے۔ عرب کے نڈر تاجروں نے اس سلسلے میں کچھ حوصلہ مندی سے کام لیا اور اپنے جزیرہ نما سے نکل کر بادبانی کشتیوں کے ذریعے متلاطم سمندروں میں دُور دراز کے سفر کرنے لگے۔ اس طرح سے ابتدائی بین الممالک تجارت عربوں کی رہینِ منت رہی۔ لیکن عرب جاہل تھے وہ اپنے موجودہ ذریعے یعنے کشتیوں پر قانع تھے۔ ان کو اس بات کا خیال نہ تھا کہ وہ اس ذریعے کو ترقی دے کر محفوظ جہاز بھی بنا سکتے ہیں۔ یورپ میں قوت محرکہ کے انقلاب نے کشتیوں کو بھی اُلٹ کر رکھ دیا۔ اب کشتیوں کو بجائے چپو اور بادبان کے مشین سے چلایا جانے لگا۔ اول اول یہ مشین آگ اور پانی سے، پھر تیل سے چلائے جانے لگے۔ اس کو اس قدر ترقی دی گئی کہ بڑے بڑے جہاز ملاحوں کی چھوٹی جماعت کی مدد سے چلائے جانے کے قابل ہو گئے جن میں سینکڑوں مسافر اور ہزاروں ٹن وزن لادا جا سکتا تھا۔ جب اس طرح سے سمندر کے گھوڑے تیار ہو گئے تو پھر ان ملاحوں کو سمندر سے کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا اور یہ عربوں کی بہادری کو بھی شکست دینے لگے۔ عربوں کی تجارت میں خطرات بہت سے تھے، یورپین تاجروں کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ نیز ان جہازوں میں کافی رسد بھی رکھی جا سکتی تھی، اس لیے یہ جہاز نسبتاً طویل مدت تک بغیر کسی مقام پر ٹھیرے سفر کر سکتے تھے۔ اس لیے اب یہ تاجر ان جہازوں میں دُور دراز ممالک سے بے خوف تجارت کرنے لگے۔ ذرایع پیدائش میں انقلاب اور پیمانۂ کبیر پر کاروبار کی اجرائی ان تاجروں کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ ان تاجروں کے ذریعے سے فیکٹری والے اپنا تیار کردہ سامان روانہ کرتے تھے اور واپسی میں خام اشیا خرید کر لانے کی ہدایت کرتے تھے۔ چونکہ اس کاروبار کو کوئی انفراداً انجام نہیں دے سکتا تھا اس لیے ملک کے تاجروں نے مل کر جہاز ران کمپنیاں بنائیں جن کے ذریعے سے تجارت کو فروغ دیا جانے لگا۔ اس قسم کی کمپنیوں کی بہترین مثال جس سے ہم بخوبی واقف ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی ہے۔ ان کمپنیوں نے اپنے فرائض کو بہت اچھی طرح انجام دیا اور اپنے ملک کی صنعتوں کو دوسرے ممالک میں رواج دینے کے لیے مختلف جائز و ناجائز طریقے اختیار کیے۔ ان کمپنیوں کو اس قدر فائدہ پہنچا کہ انھوں نے انگلستان میں اپنے حصہ داروں کو چار سو فی صد تک نفع تقسیم کیا اور جب یہاں کے گورنر جنرل کی بیوی انگلستان میں باہر نکلتی تو دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ خاندانی متمول اُمرا کی بیویاں بھی اس گورنر کی بیوی کے سامنے ہیچ معلوم ہوتی تھیں اور آخر کار اس رشک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر رشوت ستانی کا مقدمہ چلایا گیا۔ غرض یہ تجارتی کمپنیاں دنیا کا چکر لگا کر اپنے مصنوعات کی نکاسی کا بندوبست کرتیں اور خام پیداوار کے حاصل کرنے کے لیے مختلف

تدابیر پر غور کریں۔ اس طرح سے ان تجارتی کمپنیوں نے بازار کو اس قدر وسیع کر دیا کہ مصنوعات اور اغذیہ کا بازار گویا کہ ساری دنیا ہو گئی۔ دنیا کا کوئی مقام ایسا نہیں رہا جہاں صنعتی ممالک کی اشیا نہ ہوں اور کوئی صنعتی ملک ایسا نہیں رہا جو زرعی ملک پر تکیہ کیے ہوئے نہ ہو۔ اب سارے کار و بار بجائے ایک محدود شہر یا ملک میں ہونے کے ایک وسیع ترین بازار میں ہونے لگے جہاں ہر ملک کے خریدار تھے۔ ذرایع خبر رسانی کی ترقی نے اس بات کو اور زیادہ سہل کر دیا۔ آج ایک سوداگر بمبئی میں بیٹھے لندن اور واشنگٹن میں لاکھوں کا لین دین کرتا ہے اور یہ معاملے برسوں میں طے نہیں ہوتے بلکہ منٹوں میں تصفیہ پا جاتے ہیں۔ اس طرح سے ذرایع نقل وحمل و خبر رسانی نے بازار کو انتہائی وسیع کر دیا اور سارا عالم صرف ایک بازار بن گیا۔

طرز زندگی

ان سارے انقلابات کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے اپنی زندگی بسر کرنے کے طریقے کو بدل ڈالا۔ اگر ہم صنعتی انقلاب سے قبل کی زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بھدے، چھوٹے اور بد وضع لکڑی کے مکانوں میں رہتے تھے جو کسی طرح موسمی حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ خانہ داری کی ضرورتیں مثلاً باورچی خانہ، حمام، گودام، سونے کا کمرہ، کھانے کا کمرہ، تبدیل لباس کا کمرہ، ملاقاتیوں کا کمرہ وغیرہ کچھ نہ تھے۔ ان کی غذا میں چند سادہ اشیا داخل تھیں جو بھدی وضع پر گھر ہی میں تیار کر لی جاتی تھیں۔ غذا بھی ایک ہی قسم کی ہوتی تھی اس میں کسی قسم کا تنوع نہ تھا۔ غذا کی اکثر قلت ہی محسوس ہوتی تھی۔ لباس بالعموم کھالیں اور دستی پارچہ ہوتا تھا، اس میں نہ تو کانٹ چھانٹ تھی اور نہ ہی کسی قسم کی اختراعات تھیں۔ بالکل سادہ اور سپاٹ ہوتے تھے جو گھر ہی میں افراد خاندان تیار کر لیتے تھے۔ اس کے بعد طریقۂ سفر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ تو سڑکیں تھیں اور نہ ہی ریل، موٹر، جہاز وغیرہ تھے۔ اس لیے سفر بہت پُر خطر اور مصایب سے بھرے ہوئے ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ مجبوری کے سوا سفر کا نام نہ لیتے تھے۔ پیغام رسانی بالکل انسانوں اور پھر مویشیوں کی رفتار کے تابع تھی۔ اس لیے دُور دراز کے احباب کی کیفیت مہینوں بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ سیر و تفریح کا مشغلہ سرے سے غایب تھا، کیونکہ ان کو اپنی روزی کے لیے اس قدر کام کرنا پڑتا تھا کہ فرصت کا وقت ہی نہیں نکلتا۔ لیکن اگر ہم صنعتی انقلاب کے بعد کی طرز زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انسانوں کو آج بہتر وضع کے کشادہ اور دلکش مکانات میسر ہیں۔ ان کی تعمیر میں پتھر، اینٹ، چونا، لوہا وغیرہ استعمال کیا گیا ہے اس لیے یہ موسمی حالات کا کافی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آج کل ہم گرمی اور سردی کی شدت کو بھی محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ مصنوعی طریقے پر ہم اپنے مکانوں کو گرما میں سرد اور سرما میں گرم رکھنے کے

قابل ہوگئے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا چونکہ ساری دنیا سے خریدی جا سکتی ہیں اس لیے اس میں ایک تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ پکوان ایک فن کی منزل پر ہے اور لوگ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ سے غذا تیار کریں دوسروں کی تیار کردہ غذا کو حاصل کر کے استفادہ کرنے لگے۔ وہ چیزیں جن کا نام سنا نہ جن کو آج تک دیکھا اور نہ ہی یہ معلوم کہ یہ بنتی ہیں یا پیدا ہوتی ہیں ہم بڑے مزے سے چٹخارے لے کر کھاتے ہیں۔ کپڑوں کو خوب صورت بنانے میں اس قدر ترقی اور کامیابی ہوئی کہ آج اس قدر زیادہ نمونے ہمارے سامنے رکھے جاتے ہیں کہ اس میں سے پسند کرنا ایک مہم بن جاتا ہے۔ لباس کی وضع قطع میں طرح طرح تبدیلیاں ہوئیں۔ لباس کی قطع اور پھر اس کی سلائی ایک خاص پیشہ بن گئی اور اس کو ہماری معاشرت میں کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ کاروبار کے اوقات معین کر دیے گئے۔ مزدوری اس قدر دی جانے لگی جو ضروریات زندگی کو پورا کر کے سیر و تفریح کے کام بھی آسے۔ ذرائع عمل و نقل کی ترقی کی یہ دولت سیر و تفریح میں بہت سے لوگ شریک ہونے لگے۔ ذرائع خبر رسانی کی یہ دولت کسی کی جدائی پریشان کن نہیں ہوتی۔ سیر و تفریح کے بہترین مشغلے دریافت کیے گئے اور ان کو اس قدر ترقی یافتہ بنایا گیا کہ ہر شخص اس میں خاصی دلچسپی لینے لگا اور یہ بھی ضروریات زندگی میں داخل سمجھا جانے لگا۔ ان کو اس قدر سستا بنایا گیا ہے کہ معمولی کام کرنے والا شخص بھی ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ غرض کہ قوت محرکہ کا انقلاب ان سارے انقلابات کا بانی ہوا۔ اس کے ساتھ ہی طریقۂ پیدائش نقل و عمل اور پھر بازار کے مفہوم میں تبدیلی ہوئی اور پھر ان ساری چیزوں کی موجودگی میں انسان کیسے اپنی وحشیانہ اور غیر مہذب زندگی پر قناعت کر سکتا تھا، ان سب سے استفادہ کیا اور آج وہ اس مہذب رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

جب اس طرح سے انقلاب ہو گیا تو ظاہر ہے کہ انسان کے اپنے نظریات میں انقلاب ہوا۔ وہ پہلے اپنے پہ بھروسا کرتا تھا، سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ پیدا کرنا اور صرف کرنا، صرف یہی دو کام تھے۔ چونکہ یہ پیدائش صرف اس فرد، یا خاندان کے لیے کافی اور ان کے ضروریات کے مطابق ہوتی اس لیے یہاں پر تقسیم اور مبادلے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سارا خاندان مل کر پیدا کرتا، سارا خاندان مل کر صرف کرتا۔ غذا وہی حاصل کرتا، کپڑا وہی بنتا۔ لباس وہی تیار کرتا، غرض سارا کام بہ ذات خود انجام دیتا گویا کہ اس وقت خود کفیلی کا نظریہ تھا۔ اس انقلاب نے اس نظریے کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ اب خود کفیلی کا سوال نہیں تھا۔ بلکہ یہ تھا کہ ہر شخص صرف وہی کام کرے جس کو وہ آسانی سے اور عمدگی سے کر سکتا ہے اس کا نتیجہ موجودہ مرکب معاشرت ہے جس میں کوئی فرد آزاد نہیں ہے۔ اب ہر فرد باقی افراد کا

محتاج ہے۔ یہاں سے تقسیم عمل کا نظریہ فروغ پانے لگا۔ تقسیم عمل کو اس قدر وسعت اور ہمہ گیری حاصل ہوئی کہ نہ صرف ایک خاندان اور ایک ملک میں تقسیم عمل کا اصول رائج ہوا بلکہ مختلف ملکوں کے درمیان بھی اس اصول پر عمل کیا جانے لگا۔ یورپ کے سارے ممالک اپنے اندر صنعتی صلاحیت اور قابلیت کو پا کر اس قدر از خود رفتہ ہوئے کہ وہ صرف صنعت پر تکیہ کیے رہے اور خام اشیا کی سربراہی مشرق کے حصے میں آئی۔ یورپی ممالک صرف مصنوعات تیار کرتے لیکن خام اشیا اور خود اپنی غذا کے لیے وہ مشرق کے محتاج رہنے لگے۔ یہ اصول جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں چکنا چور ہو گیا۔ اب ان مغربی علما کو معلوم ہوا کہ یہ اصول تو موت کی طرف رہبری کرتا ہے۔ کیونکہ ساری دنیا کا باہمی ربط اور پھر غذا کے لیے دوسروں پر انحصار جنگ کی حالت میں کسی طرح عاقبت اندیشانہ نہیں ہے جنگ کے زمانے میں راستے خطرناک ہو جاتے ہیں اور دشمن کی کارروائیاں رسد کی آمد کو بُری طرح سے روکتی ہیں۔ اس لیے جب جنگ عظیم سے نجات حاصل ہوئی تو پھر دوبارہ خود کفالتی کا اصول اختیار کیا گیا۔ یورپ میں زراعت کی طرف پھر توجہ ہونے لگی لیکن یہ بہت ناکافی تھی۔ اسی تقسیم عمل کے اصول کی تعلیم کے وقت ہندوستان کے ذمہ زراعت یعنے خام پیداوار کی سربراہی ہوئی اور یورپ خصوصاً انگلستان، ہندوستان کے لیے مصنوعات کی سپلائی کا ذمہ دار رہا۔ اگرچہ جنگ عظیم میں یہ اصول فرسودہ ہو گیا لیکن انگلستان اور ہندوستان کے گہرے تعلقات کبھی اس بات کے متقاضی نہ ہوئے کہ ان دو ممالک کے درمیان جو تقسیم عمل باقی ہے اس کو ختم کیا جائے حالانکہ سارے یورپ نے بڑی حد تک اپنے کو خود کفیل بنانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی۔

انگلستان کی صنعتی ترقی بہت حیرت انگیز چیز تھی اور جب اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندوستان مل گیا تو پھر اس کو مصنوعات کی نکاسی کی کوئی فکر نہ رہی۔ نیز خام پیداوار کے لیے بھی اس کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں تھا۔ لیکن اس کا بُرا نتیجہ وہ تھا جس کو جنگ عظیم میں محسوس کیا گیا۔ غذا کے لیے دوسرے ملکوں پر انحصار ایک سخت غلطی تھی اس کی بہ دولت جنگ عظیم میں انگلستان کو بہت پریشان ہونا پڑا تھا۔ جب تک ہماری ایک اہم اور لازمی ضرورت دوسروں کے ہاتھ میں ہو تو ہم کو کسی طرح کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کا کیا تھا وہ تو کسی حال میں بھی بھوکا نہیں مر سکتا۔

اب اس کا نتیجہ ہندوستان میں دیکھیے کہ یہاں انگلستان کے برعکس نتائج پیدا ہوئے۔
صنعتی انقلاب سے یورپ میں زراعت ختم ہو گئی اور تقسیم عمل کی وجہ سے صنعت کو فروغ نہ ہوا۔ ہندوستان میں اس صنعتی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی صنعتیں تباہ ہو گئیں، یہ کیسے تباہ ہوئیں یہ ایک

داستان ہے لیکن یہ صاف و صریح ہے کہ صنعتیں تباہ ہوئیں اور اس کے بدلے زراعت مستقل پیشہ بن گئی۔ زراعت میں بھی ہمارے پاس کسی قسم کی ترقی نہیں ہوئی اور آج اکثر دماغ ہماری زراعت کے نقایص معلوم کرنے میں مصروف ہیں حالانکہ عملی اقدام کا فقدان ہے۔ آلات۔ تخم۔ قوت محرکہ۔ کھاد۔ ذرایع حمل و نقل وغیرہ سارے کے سارے وہی رہے جو صنعتی انقلاب سے پہلے تھے۔ ان میں زمانے کے لحاظ سے کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف انقلاب یا تبدیلی ہوئی تو پیشے میں۔ لیکن یورپ میں تبدیلی پیشہ کے ساتھ ساتھ اس پیشے کو بام عروج پر پہنچایا گیا۔ لیکن ہندوستان میں اس پیشے کو جہاں کا وہیں رکھا گیا۔ غذا کی حد تک ہندوستان نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ مغرب کے اکثر ممالک کا سہارا ہے لیکن صنعت میں ہندوستان بری طرح سے دوسروں کا محتاج ہے۔ اس محتاجی نے اپنی مہیب شکل اس وقت اختیار کی جب کہ جنگ عظیم چھڑی۔ آج ہم انگلستان کے اس قدر محتاج نہیں ہیں جتنے جنگ عظیم سے قبل تھے، لیکن پھر بھی دوسرے ملکوں کے ضرور محتاج ہیں۔ اس وقت ہماری صنعتی ضروریات کو امریکہ اور امریکہ سے زیادہ جاپان پورا کر رہا ہے اور اگر کسی طرح سے یہ ممالک بھی جنگ میں گھسیٹے گئے تو پھر ہماری صنعتی ضروریات کا خدا ہی حافظ ہے۔

انوار احمد صدیقی سابق طالب علم

واردات

ستم کش ہوں مگر یہ جور اب میں سہہ نہیں سکتا
بچھڑ کر آپ سے دو دن بھی زندہ رہ نہیں سکتا

نہ جانے ان دنوں کیا ہو گیا رگ رگ میں نشتر ہے
میں جو محسوس کرتا ہوں وہ تم سے کہہ نہیں سکتا

کوئی کیا شرح کر سکتا ہے آدابِ محبّت کی
کہ اک طوفاں ہے دل میں لیکن آنسو بہہ نہیں سکتا

وہ کہتے ہیں کہ ضبطِ غم، محبّت میں ضروری ہے
ادھر کمبخت دل ترچھی نظر بھی سہہ نہیں سکتا

دلِ بے تاب کے ہوتے ہوئے راحت کہاں کاوشؔ!
یہ وہ کمبخت ہے جو دو گھڑی خوش رہ نہیں سکتا

کاوشؔ (سابق طالبعلم)

ہماری غذا

غذا کا کام | چالیس سال کی عمر تک بھی ہمارے بدن نشو و نما پاتے رہتے ہیں۔ خصوصاً دوران نشوونما میں اور زندگی بھر عموماً جسم کے بعض اعضا ہمیشہ مصروف عمل رہتے ہیں۔ دل حرکت کرتا اور خون کو جسم کے ہر حصے میں دوڑاتا رہتا ہے۔ پھیپھڑے ہوا لیتے ہیں جس میں آکسیجن، جو ہماری زندگی کو برقرار رکھنے والی ہے داخل ہوتی ہے، اور ناک اور منہ کے ذریعے مضرت رساں بخارات جو جسم کے دوران عمل میں پیدا ہوتے ہیں خارج ہو جاتے ہیں۔ معدہ اور آنتیں غذا کو ہضم کرنے کے بعد ان اشیا کو جو بدن کے بننے میں مدد دیتی ہیں خونی نثر یانوں میں دوڑاتی ہیں۔ آنتیں، گردے اور جسم پر کی کھال تمام اندرونی فضلات کو خارج کرتی ہے۔ دماغ جسم کی رہبری کرتا ہے اور عضلات اعضا کو حرکت دیتے ہیں۔ یہ تمام عمل و حرکت مسلسل جاری ہے ان بے شمار خلیات کو جن سے جسم مرکب ہے ہمیشہ تغیر و تبدل و اصلاح و درستی کی ضرورت رہتی ہے۔ پس غذا کا سب سے پہلا کام ان اشیا کا جمع کرنا ہے جو بدن کے بننے اور نشوونما میں ضروری ہیں۔

بدن کی حرکتیں | بہت سی ایسی حرکتیں ہیں جن کا ہم کو شعور بھی نہیں ہوتا جو اپنے عمل کے لیے توانائی پیدا کرتی ہیں۔ اس کے پیدا ہونے سے گرمی کا ظہور ہوتا ہے جو ہمارے بدن کو گرم رکھتی ہے۔ غذا کے اور بھی دوسرے کام ہیں، لیکن وہ سب ان دونوں (یعنی جسم کا نشوونما اور توانائی و گرمی) کے خادم ہیں۔ یہ دونوں ایک بڑے نتیجے یعنی ہماری قوت حیات کے کمال کی انتہائی سطح کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہم نہ صرف اس لیے کھاتے ہیں کہ زندہ رہیں بلکہ اس لیے کہ ہم انسانی کمال کو حاصل کرنے والی زندگی بسر کریں۔

نشوونما یا جسم کا بننا | اکثر امور میں ہمارے بدنوں کا نشوونما ایک گھر کی تعمیر کی طرح ہے جب ہم گھر بنانا

چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہم وہ اشیا جمع کرتے ہیں جو گھر کی ساخت میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً پایہ کے لیے پتھر۔ دیواروں کے لیے اینٹ۔ دروازوں کے لیے لکڑی اور چھت کے لیے پلاستر۔ لیکن پتھر، اینٹ، لکڑی اور پلاستر بے جان ہیں اور وہ خود بہ خود گھر کا کوئی حصہ نہیں بن سکتے، بلکہ میستری راج مزدور اور نجار کو بلانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ان کو مناسب جگہ لگا کر گھر بنائیں جس طرح گھر کی تعمیر کی اشیاء اچھی بُری یا متوسط ہوتی ہیں اور جس طرح ہم ہر کام کے لیے اچھے کاریگر کو بلاتے ہیں۔ پس اسی طرح جب گھر تیار ہو جاتا ہے تو وہ بھی یا تو اچھا ہوگا یا بُرا یا متوسط۔ پس اسی طرح جسم کے گھر کی بھی حالت ہے کہ ایک دفعہ خراب بنا تو پھر اس کی ہمیشہ درستی ہوتی رہنی ضروری ہے۔ آنتیں غذا میں سے ان اشیا کو جو جسمی گھر کی ساخت کے لیے ضروری ہیں منتخب کر لیتی ہیں۔ یہ منتخب شدہ غذا خون کی شکل میں شریانوں میں سے گذرتی اور جسم کے ہر حصے کو ایک خاص چیز سے بھر دیتی ہے جو اس کے بنانے کے لیے ضروری ہے۔ وہ اشیا جو جسم کے نشوونما کے لیے ضروری ہیں، اجزائے لحمیہ اور معدنی نمک ہیں اور تقریباً ویسے ہی بے جان ہیں جیسے گھر کا چوبینہ۔ یہ خود بہ خود جسم کا کوئی حصہ نہیں بن سکتے۔ لہذا کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے جسم میں سب سے بڑا کاریگر ہماری اندرونی قوت حیات ہے جو اپنے بہت سے مددگاروں کے ساتھ درپے عمل ہے۔ ان میں کے بعض مددگاروں کو حیاتین کہتے ہیں جو ہماری زندگی کے اہم اجزا میں سے ہیں۔ یہ اسی طرح جسم کے نشوونما کا بہت سارا کام انجام دیتے ہیں جس طرح گھر کے بنانے میں میستری، اوڑ اور نجار کام دیتے ہیں۔ یہ بھی ان کاریگروں کی طرح علٰحدہ علٰحدہ نام رکھتے ہیں۔ مثلاً حیاتین ا۔ ب۔ ج۔ د۔ ہ۔ ہر حیاتین کا کام جدا جدا ہوتا ہے لیکن ہر ایک دوسرے کو مدد دیتا ہے جیسے میستری۔ اوڑ اور نجار گھر بنانے میں ایک دوسرے کو مدد دیتے ہیں۔ پس حیاتین اَ آنکھ، پھیپڑے، معدہ اور آنتوں کے۔ حیاتین بَ دماغ، اعصاب۔ گوشت، دل معدہ اور آنتوں کے۔ حیاتین جَ خون کے۔ حیاتین دَ دانت اور ہڈیوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ اگر غذا بہترین ہو تو اس میں تمام حیاتین اور وہ تمام اشیا جو تعمیر بدن میں مستعمل ہوتی ہیں پائی جائیں گی، اور غذا اچھی نہ ہو تو نہ تو اس میں اشیائے تعمیری کافی ہوں گی اور نہ کافی مفید۔ پس جسم کی ساخت کلیتہً یا جزاً ناقص رہ جائے گی نتیجتہً وہ اپنے اس عمل سے جس کے لیے وہ بنایا گیا ہے قاصر رہے گا۔ مثلاً اگر گھر کی چھت بنانے والا یا گھر کا چوبینہ خراب ہو تو اس میں سے بارش کا پانی ضرور ٹپکے گا۔ پس ہڈیاں بھی جن کا کام جسم کو تھامے رکھنا ہے کمزور ہو جائیں گی یا خم ہو جائیں گی۔ دانت جن کا کام غذا کو چبانا ہے کمزور یا اوایل عمر ہی میں بوسیدہ ہو جائیں گے، اعضا ڈھیلے پڑ جائیں گے اور حرکت کرنے کی قوت زایل ہو جائے گی پھیپڑے جو آکسیجن فراہم کرنے والے ہیں، اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔ معدہ اور آنتیں جو غذا کو ہضم کرنے والی

اور فضلہ کو خارج کرنے والی ہیں اپنے عمل سے عاجز رہیں گی پس اس طرح بہت ساری بیماریوں کی بنیاد پڑ جائے گی۔

دوسرے الفاظ میں ہمارے جسم کی مثال ایک دخانی مشین کی سی ہے۔ مشین کتنا ہی بہتر بنایا گیا ہو مگر اس میں بخارات نہ ہوں تو وہ نہ چل سکتا ہے اور نہ وزن کو کھینچ سکتا ہے۔ وہ بخارات جو اس کو درکار ہیں پانی کو گرم کر کے حاصل کیے جاتے ہیں۔ جب بخارات تیار ہو جاتے ہیں تو ان کو مشین کی نالیوں میں دوڑایا جاتا ہے، وہاں وہ فشارہ کو دابتے ہیں جس سے مشین کو حرکت ہوتی ہے اور وہ وزن کو کھینچ سکتا ہے۔ بخارات ایندھن کی حرارت سے تیار ہوتے ہیں اور بخارات فشارہ میں داخل ہو کر مشین کو حرکت دیتے ہیں۔ جب مشین کی حرکت تیز ہوتی ہے تو وہ وزن بھی زیادہ کھینچتا ہے۔ تیز حرکت کے لیے بخارات زیادہ ہونے ضروری ہیں اور زیادہ بخارات کے لیے زیادہ ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس اس طرح جسم کی بھی حالت ہے، گو یہ جسمی مشین دخانی مشین سے بہت اعلیٰ اور منظم تیار کیا گیا ہے تاہم بغیر بخارات یا اس کی مخصوص توانائی کے یہ بھی نہیں چل سکتا۔ یہ قوت اسی طرح فراہم کی جاتی ہے جس طرح دخانی مشین کے بخارات۔

ہم میں سے ہر ایک کے جسم میں ایک خاص قسم کی حرارت ہے جس کو طبی اصطلاح میں حرارت غریزی کہا جاتا ہے جو ہمارے جسموں کو گرم رکھتی ہے۔ اسی حرارت کا نام زندگی ہے، اور اسی حرارت کے ختم ہونے کا نام موت ہے۔ اس حرارت کو گو ہم دیکھ نہیں سکتے لیکن محسوس کر سکتے ہیں۔ دخانی مشین کی طرح یہ بھی ایندھن چاہتی ہے، یہ ایندھن ہماری غذا سے فراہم کیا جاتا ہے جس کو چربی اور اجزائے نشاستہ توانائی کے مخزن کہتے ہیں، اسی چربی اور اجزائے نشاستہ و لحمیہ سے جو جسم کے نشوونما اور رہنے کے بعد بچ رہتے ہیں ہماری حرارت حیاتی کے اثر سے توانائی پیدا ہوتی ہے جس سے جسم کا مشین اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ جسم جتنا زیادہ کام کرے گا اتنا ہی اس کو ایندھن کی ضرورت ہوگی۔ پانی جو ہمارے جسم میں بھرا ہوا ہے اس توانائی کے پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جسمانی توانائی کا دوسرا منبع سورج کی روشنی ہے۔ ہماری غذا میں جو اجزائے نشاستہ موجود ہیں، ان میں سورج کی روشنی توانائی پیدا کرتی ہے۔

دخانی مشین میں جب تک خاصی ہوا موجود نہ ہو آگ نہیں جل سکتی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آگ جلانے کے لیے پھنکنی استعمال کی جاتی ہے، اس لیے کہ ہوا میں جو آکسیجن ہے وہ وہاں پہنچ کر آگ کو جلنے میں مدد دیتی ہے۔ جسم کی آگ کی بھی یہی حالت ہے، یہ بھی آکسیجن کی بڑی مقدار کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہمارے پھیپھڑے پھنکنیوں کا کام دیتے ہیں جن سے آکسیجن فراہم ہوتی ہے۔ جس طرح دخانی مشین کی آگ اپنی حرارت خارج کرتی ہے اسی طرح ہمارے جسم کی آگ بھی کچھ خارج کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جسم کو گرم رکھتی ہے۔ اس خیال سے کہ ہم بہت گرم نہ ہو جائیں، ہمارا خون گاڑھا نہ ہو جائے یا ہمارا گوشت اور چمڑا

خشک نہ ہو جائے، ہم بہت سا پانی پیتے ہیں، پس وہ اشیا جو ہمارے جسم کے نشوونما اور اس کے بننے اور تندرست رکھنے کے لیے ضروری ہیں وہ یہ ہیں:۔ ہوا، روشنی، پانی، غذا، اور ان کے ساتھ ساتھ ورزش اور آرام۔

ہماری غذا کے اہم اجزا پانچ ہیں :۔ اجزائے لحمیہ، معدنی نمک، چربی، اجزائے نشاستہ اور حیاتین۔ ان میں سے ہر ایک اہم اور ضروری ہے اور ہر ایک دوسرے کا محتاج۔ ہماری غذا میں یہ پانچ چیزیں صحیح تناسب میں ہونی ضروری ہیں۔ قدرت نے ہر غذا سے بعض مذکورہ چیزوں کو فراہم کیا ہے لیکن کوئی غذا ایسی نہیں جس میں یہ تمام اشیا صحیح تناسب میں موجود ہوں۔ ہم کو زندگی بخش اجزا رکھنے والی غذاؤں کا متناسب استعمال کرنا چاہیئے تاکہ ہمارا جسم غذا سے تمام اہم اشیا کی حسب ضرورت مقدار حاصل کر سکے۔

نام غذا	اجزائے لحمیہ فی اونس گرام میں	اجزائے نشاستہ فی اونس گرام میں	چربی فی اونس گرام میں	حرارہ فی اونس گرام میں	حیاتین ا	ب	ج	د
وہ اشیا جن میں حیاتین زیادہ پائے جاتے ہیں گائے، بھینس، بکری، عورت کا دودھ	٫۴۹	۱٫۰۲	۱٫۳۶	۱۸	+++	++	+	+
بالائی	٫۷	۱٫۷۲	۵٫۲۴	۵۵	+++	+	...	+
جگر جانوروں کا	۶٫۱۱	۰٫۷	۱٫۷۰	۴۳	+++	+++	+	+
مچھلی	۵٫۳۲	...	۳٫۷	۵۵	+++	+	...	...
مچھلی کا تیل	...	...	۲۸	۲۵۲	+++	...	...	+++
مسکہ ۔ گھی	...	...	۱٫۲۳	۲۰۸	+++	...	...	+
ہرے نباتات (حیاتین ب)۔	۵٫۳۱	٫۸۲	٫۰۶	۸	+++	+++	+++	...
ٹماٹو	٫۲	۱٫۷۲	٫۰۳	۶	+++	+++	+++	...
جگر جانوروں کا	۶٫۱۱	٫۷	۱٫۷	۴۳	+++	+++	+	+
انڈے	۳٫۹۷	...	۲٫۷۹	۴۲	++	+++	...	+
اخروٹ	۳٫۵۸	۳٫۹۶	۱۹٫۲۹	۲۱۱	...	+++	...	...
اجوائن خراسانی	٫۱۷	۱٫۰۷	٫۰۳	۵	...	+++	++	...
(حیاتین ج) سنترہ	٫۲۵	۲٫۷۹	٫۰۳	۱۲	+	+	+++	...

نام غذا	اجزائے لحمیہ فی اونس گرام میں	اجزائے نشاستہ فی اونس گرام میں	چربی فی اونس گرام میں	حرارہ فی اونس گرام میں	حیاتین ا	ب	ج	د
لیمو	٫۱۴	٫۸۸	٫۱۴	۵	+	+	+++	۰۶۰
وہ اشیا جن میں اجزائے لحمیہ زیادہ ہوتے ہیں بکری، گائے، بھینس، سور کا گوشت، بڑ	۶٫۲	...	۲٫۱	۴۰تا۱۵۵	صفر	+	صفر	بہت تھوڑے
بط	۵٫۰۹	...	۲٫۹۴	۵۰	−+	+	...	...
کبوتر	۶٫۲۵	...	۱٫۸۶	۴۲	+	+	...	...
بادام	۵٫۲۶	۴٫۳	۱۵٫۹۷	۱۸۲	قلیل	++	صفر	...
مونگ پھلی	۷٫۳	۶٫۹	۱۰٫۹۲	۱۵۵	قلیل	++	صفر	...
وہ اشیا جن میں چربی زیادہ ہوتی ہے								
پنیر	۷٫۳۵	۰٫۵	۹٫۸۸	۱۱۱	++	قلیل	...	...
گوشت سور	۵	...	۱۵	۱۵۵	صفر	...	...	...
مختلف تیل	...	...	۲۸	۲۵۲	+	صفر	صفر	قلیل
وہ اشیا جن میں اشیائے نشاستہ زیادہ ہوتے ہیں گڑ، نیشکر و شکر	...	۲۶	...	۱۰۸	صفر	صفر	صفر	...
شہد	٫۱۱	۲۰٫۲۱	...	۸۱	قلیل	قلیل	صفر	...
مختلف قسم کا غلہ۔ اوسط	۲٫۹	۲۲٫۵	٫۵	۷۰تا۱۱۵	+تا++	++	صفر	...
منقی، کشمکش، کھجور، انجیر، جام۔ اوسط	٫۵	۱۵٫۰	٫۰۹	۷۰تا۸۰	...	+	صفر	...
وہ اشیا جن میں حرارہ زیادہ ہوتے ہیں								
پنیر، سور کا گوشت، جانوروں کی چربی، گڑ، نیشکر، شکر، شہد، غلہ، نباتاتی تیل	ان کا بیان اوپر آچکا ہے							

نوٹ:- (+++) کے معنے بہت مالدار کے ہیں
(++) ” متوسط ” ”
(+) کے معنے کم مالدار کے ہیں
(...) ” ابھی تک اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوا۔

سید محمود محمودی بسال اول

فانیؔ مرحوم

شوکت علی خاں صاحب فانیؔ قصبۂ اسلام نگر ضلع بدایون کے رہنے والے تھے۔ وہ سنہ ۱۸۷۹ء میں اپنے قصبۂ مذکور میں پیدا ہوے۔ اور ابتدائی عمر کا زمانہ وہیں گذارا۔ تیرہ سال کی عمر تک انکی تعلیم خانگی طور پر ہوی اور انھوں نے مشرقی طرز پر عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اس کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی۔ اور ضلع کے سرکاری مدرسہ میں تعلیم پاتے رہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے بریلی کالج سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور سنہ ۱۹۰۶ء میں علی گڈھ کالج میں قانون پڑھنے کے لئے داخل ہوے اور سنہ ۱۹۰۸ء میں ال۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ انکی انگریزی قابلیت بھی کچھ کم نہیں تھی اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے شکسپیر اور ملٹن کے اکثر ڈراموں کا اردو ترجمہ کیا جو ادبی حیثیت سے کافی مستند ہے۔

فانیؔ کو ابتدائے عمر ہی سے اردو ادب اور شاعری سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے گیارہ بارہ برس ہی کی عمر سے شاعری شروع کر دی تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے سنہ ۱۸۹۰ء میں اپنی غزل کہی تھی اور بیس سال کی عمر میں اپنا پہلا دیوان مکمل کر لیا۔ لیکن چونکہ وہ ذرا لاپروا انسان تھے۔ اور نام و نمود اور شہرت کے کچھ زیادہ خواہاں نہ تھے اس لئے وہ دیوان ضائع ہو گیا اور کسی کو اس کا پتہ نہ چل سکا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے اپنا دوسرا دیوان تیار کیا۔ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے دیوان کا ہوا تھا۔ اس لئے سنہ ۱۹۱۷ء تک وہ دل برداشتہ شاعری سے الگ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کہا یا ان کا ضائع شدہ کلام جسقدر بھی مل سکا وہ رسالہ "نقیب" بدایون کے دفتر سے ان کے پہلے دیوان کی صورت میں شائع ہوا۔ اور

دوسرا دیوان ۱۹۲۶ء میں "**باقیات فانی**" کے نام سے نکلا جو واقعی ان کے اصلی رنگ کا مظہر، ان کی خصوصیات شاعری کا حامل اور موجودہ شاعری میں ایک انمول چیز ہے۔

ان کے کلام کے مطالعہ سے ان کے کردار کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے، انکی زندگی، رنج والم اور یاس وحرمان کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور مایوسیوں اور ناکامیوں کی داستان۔ وہ ہمیشہ کشاکش حیات سے پریشان رہے۔ لیکن افسوس کہ انھیں چین نہ مل سکا۔ انھوں نے لکھنو، بریلی، اٹاوہ اور آگرہ وغیرہ میں ہر جگہ قسمت آزمائی کی لیکن کہیں کامیاب نہ ہوسکے۔ البتہ جب وہ ریاست حیدرآباد آئے تو انھیں کچھ بے فکری ہوگئی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد آنجہانی نے جو علم و ہنر کے بیحد قدردان تھے فانی کے کمال کو پہچانا۔ انکی قدر کی اور اپنی سرکار سے کچھ وظیفہ مقرر فرمایا۔ اس کے بعد وہ محکمۂ تعلیمات میں صدر مدرسی کی خدمت پر مامور کئے گئے۔ غرض شاد آنجہانی کی زندگی تک تو وہ آرام سے رہے، لیکن اس کے بعد پھر مصائب نے ان کو ہر طرف سے آگھیرا اور وہ پھر نہایت ہی پریشان حال ہوگئے۔

فانی کی زندگی ظاہرا ایک ناکام زندگی معلوم ہوتی ہے لیکن جو ناکامیاں ان کو نصیب ہوئیں انھوں نے اُن کے کردار میں ایک خاص تغیر پیدا کردیا تھا۔ وہ دنیاوی لباس میں ایک فلسفی اور درویش تھے۔ وہ نہایت ہی لطیف احساسات رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ تباہیوں اور بربادیوں کا مسلسل شکار ہوا کئے۔ وہ ایسے حرماں نصیب تھے کہ متواتر اور پیہم چوٹوں سے اِن کے آنسو بھی خشک ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

مسلسل رنج وغم سے ان کی مسکراہٹ بھی آہ بنجاتی تھی، اور ان کو اسی میں لطف آتا تھا۔ ان کے کلام میں فلسفۂ محبت، تدبیر و تقدیر، مجاز وحقیقت، رازِ فنا اور نظریات و مسلمات کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ زبان نہایت ہی سلیس اور آسان ہے۔ جس میں جا بجا محاورے اور روز مرّے ملتے ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کا یہ مایۂ ناز شاعر ۲۱ر مہر روز سہ شنبہ ۱۳۵۰ف کو ہم سے بچھڑ گیا۔ اور عجیب غربت وپریشان حالی میں ان کی موت واقع ہوی۔ افسوس کہ زندگی میں ان کی کچھ قدر نہ ہوی۔ زمانے نے فانی کو نہیں پہچانا۔

لیکن فانی کی حقیقی شہرت اور عزت اب ہوگی اور جب تک اُردو زبان اور اردو شاعری زندہ ہے ان کا نام باقی رہے گا۔ محفل شعرا میں ان کی روح غالب و میر کی روحوں کے ساتھ ہوگی۔

فانی نہایت ہی اعلیٰ کردار کے حامی اور نہایت ہی غیرت مند انسان تھے۔" اگر وہ اپنی شاعری

کو پیشہ بنا لیتے تو ہزاروں شاگردوں کے ہجوم میں مشاعروں کے میدانوں کو سر کر لینا ان کیلئے کچھ دشوار نہ تھا لیکن وہ ہر کس و ناکس کے سامنے اپنے شعر بھی سُنانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور یہی ان کے کردار کی حقیقی عظمت تھی۔ اب ہم فانیؔ کے چند مختصر حالات بیان کرنے کے بعد ان کے چند اشعار پیش کرتے ہیں:۔

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانیؔ
زندگی نام ہے مَر مَر کے جیئے جانے کا

دیکھ فانیؔ وہ تری تدبیر کی میّت نہ ہو
ایک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

کسی کے ایک اشارے میں کسی کو کیا نہ ملا
بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

ایک مُعمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سُلا دیا

اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یارب
در و دیوار دئے اب انھیں ویرانے دے

ترکِ غم ساحل کا حاصل نظر آتا ہے
لے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی پر بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

چلے بھی آؤ - وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حُسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ ؛

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ ؛

غم مٹا دیا غم کا لذت آشنا کر کے
کیا کیا ستمگر نے خوگر جفا کر کے

مرے شوق نے سکھایا اُسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

اِک فسانہ سُن گئے کچھ کہہ گئے ؛
میں جو رویا مُسکرا کر رہ گئے ؛

نہ دل کے ظرف کو دیکھو : طور کو دیکھو :
بَلا کی دُھن ہے تمھیں بجلیاں گرانے کی

موت آئے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی - مرنا بھی مشکل ہو گیا ؛

اسی کو تم گرا اے اہلِ دُنیا جان کہتے ہو
وہ کانٹا جو مری رگ رگ میں رہ رہ کر کھٹکتا ہے

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دُھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

جان سی شئے بِک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

سید عابد حسین رضوی متعلم سال دوم

میرؔ و غالبؔ کی آخری یادگار

فانیؔ کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

حضرتِ فانیؔ سے میری عقیدت کی کوئی وجہ شائد میں نہ بتا سکوں، ممکن ہے کہ مجھے ان کے اوصافِ حمیدہ اور کمالِ فن نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہو۔ یوں تو بچپن ہی سے فانیؔ کے سرمدی نغمے کانوں میں گونجا کرتے تھے لیکن ان کی حقیقی عظمت اس وقت مجھ پر آشکار ہوی جبکہ میں نے کچھ ہوش سنبھالا اور ادب سے مجھکو کچھ دلچسپی ہونے لگی۔ حضرت فانیؔ کو میں نے پہلی مرتبہ اُس وقت دیکھا جبکہ وہ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ چنچل گوڑہ پر صدر مدرس ہوکر تشریف لائے، میں بھی اسی مدرسہ کی ایک جماعت کا طالب علم تھا۔ ابھی کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان کا تبادلہ ناندیڑ پر ہوگیا۔ اور اس طرح عارضی طور پر ہم سے جدا ہوگئے۔ دورانِ صدارت میں مرحوم نے وہ بہترین اور پُرخلوص نقوش اساتذہ اور طلباء کے قلوب پر چھوڑے جنکی یاد ہمیشہ باقی رہیگی۔ اسی زمانے میں شعرگوئی کا مجھے بھی شوق ہو چلا تھا۔ چنانچہ اصلاح کے لئے بے اختیار نظریں حضرت فانیؔ پر پڑیں۔ اور میں نے ناندیڑ کو ان کے ہاں غزلیں روانہ کیں۔ لیکن صاحب موصوف کے بلدہ آنے پر میں خود ان کے سخن کدہ واقع تلے پلی پر جاکر ملا۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ اور نہایت شفقت سے پیش آئے۔ اس طرح ایک عظیم المرتبت شاعر سے شرفِ تلمذ و نیاز حاصل ہوگیا۔ اس کے بعد اکثر میں فانیؔ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ان کی محفل میں عجیب دلچسپی ہوا کرتی تھی جس میں عموماً ادبی اور سیاسی مباحث ہوا کرتے تھے۔

سوانح:۔ فانیؔ کا اصل نام شوکت علی خاں تھا۔ یہ بدایون میں پیدا ہوے۔ اوائل عمر ہی سے شعرگوئی کا شوق تھا۔ تعلیم کی خاطر عزیز وطن سے جدا ہوکر علی گڈھ آئے اور یہاں سے ال ال بی کیا۔ دورانِ تعلیم میں مشق

سخن جاری رہی چنانچہ انھوں نے اپنی پہلی غزل ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج کے مشاعرہ میں (جس میں جناب حسرت موہانی شریک تھے) سنائی۔ بی اے، پاس کرکے کچھ دن ملازمت کی۔ لیکن پھر ایل ایل۔ بی کرکے وکالت شروع کی۔ اس پیشے میں بھی ان کا دل نہ لگا۔ اور دکن کی کشش اُن کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔ چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد آنجہانی کی قدر دانی کی بنا پر وہ دکن چلے آئے۔ کمالِ فن نے والا شان نواب معظم جاہ بہادر کی بارگاہ میں بھی پہونچا دیا۔ اس طرح فانی نے دکن میں کچھ دن آسودگی میں بسر کئے۔ لیکن بہت جلد ان کے رفیقِ زندگی یعنی غم نے پھر ان سے پیمانِ وفا باندھا اور آخر دم تک ساتھ رہا۔

حلیہ :- میانہ قد، چھریرا بدن، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، چھوٹی چمکدار آنکھیں، گندم نما رنگ، کشادہ دہن، اور پاٹ دار آواز کے آدمی تھے۔ فانی ہر اُس مخلص سے جو اُن سے ملنے آتا بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار کوئی ان سے مل لیتا تو وہ ہمیشہ ان سے ملنے کا متمنی رہتا تھا۔ وہ ہر ایک کی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا برابر عزت کیا کرتے تھے۔ جس کے باعث ہر وقت ادبار، شعراء، امراء اور طلبا اُن کے مکان پر آیا کرتے اور اپنے اپنے مذاق کے موافق دلچسپی پاتے تھے۔

جبر و قدر ایک مابہ النزاع مسئلہ ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ انسان مختار ہے اور ہر کام وہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ لیکن بعض علماء انسان کو مجبور بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان قدرت کے منشا کے خلاف ذرہ برابر بھی کوئی کام نہیں کرسکتا۔ فانی بھی ان لوگوں میں سے تھے جو جبر کے قائل تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
قید ایسی ہے کہ زنجیر بھی درکار نہیں

ایک دفعہ اپنے مکان کے سامنے بیٹھے ہوے تھے مکان کے بالکل روبرو ایک سائبان کو چند مزدور کھول رہے تھے جو کسی شادی کے موقع پر نہایت محنت سے سجایا گیا تھا۔ انھوں نے غور سے اس کھلتے ہوے سائبان کو دیکھا اور کہا کہ انسان انجام کو جان کر بھی ایک کام کرنے پر مجبور رہے، اسی کو دیکھو کہ چار دن قبل کس محنت اور جانفشانی سے اسکو تیار کیا گیا تھا، حالانکہ بنانے والے اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ اسکو کھولنا پڑیگا۔ لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور رہے۔ مثلاً ہم کوئی چیز لکھ رہے ہیں۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے منشا کے مطابق لکھ رہے ہیں لیکن ایک چھپی ہوی طاقت ہم سے لکھواتی ہے جو اسکو منظور ہے۔

تدبیر اور تقدیر کے معاملے میں ان کی رائے بین بین ہے۔ بعض اشعار میں وہ تقدیر پر شاکر اور بعض میں تدبیر کے موافق نظر آتے ہیں، مثلاً:-

جب میں نے دعاؤں کا رُخ سوئے فلک دیکھا
تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اِک جنازہ جارہا ہے دوش پر تقدیر کے

فانی نے حیدر آباد کو وطن ثانی بنا لیا تھا، لیکن پھر بھی وطن سے بہت محبت تھی۔ ایسا وطن جہاں انھوں نے خوشحالی کے دن گذارے تھے۔ عسرت اور غریب الوطنی نے اس جذبہ کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ چنانچہ ان اشعار میں وطن کی یاد کس پُرسوز انداز میں کی ہے:-

فانی اپنی خانہ بدوشی خانہ خرابی کیا کہیئے
خاکِ وطن ہی راس نہ آئی غربت تو پھر غربت ہے

غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا
فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن

فانی کا کلام سراپا سوز میں ڈوبا ہوا تھا جسکی وجہ دنیا اُن کو ایک قنوطی شاعر تصور کرتی ہے۔ یہہ تو میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ لوگ ان کا کلام پڑھکر رُو دیتے تھے۔ چنانچہ میرے ایک عزیز ہیں جو اچھی طرح گاتے ہیں۔ جب ان سے گانے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے فانی کی یہہ غزل نہایت درد بھری آواز میں شروع کی۔

شوق میں ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اِک اِک ساتھی چھوٹ گیا

جوں جوں وہ گاتے تھے ان کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ آگے نہ گا سکے۔

فانی اکثر اپنا کلام ترنم میں پڑھا کرتے تھے۔ آواز میں درد تھا چنانچہ جب اپنا کلام سُناتے تو عجب وجدانی کیفیت سُننے والوں پر طاری ہو جاتی تھی۔ غالب کی طرح وہ بھی اشعار کی اصلاح سے جی چُراتے تھے لیکن مجبوراً بہت سے لوگوں کو اصلاح دیتے تھے۔ طریقۂ اصلاح یہ تھا کہ غزل پڑھنے کو کہتے اور خود سنتے رہتے۔ جب کوئی شعر اصلاح طلب ہوتا تو اسکی اصلاح فرما دیتے اور اچھے اشعار کی دبی آواز میں تعریف فرما دیا کرتے۔ وہ بہت کم اشعار کاٹا کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اگر پورا شعر کاٹ دیا جائے تو کہنے والے کا خیال باقی نہیں رہتا اور دوسرا شعر کہدینے سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر بہت ذرا سے رد و بدل سے شعر میں ایک خوبی پیدا کر دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ شاعر بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے حقیقی شعر وہی ہے جس میں شعریت ہو اور جو دلوں میں ایک جوش پیدا کر دے۔ اگر کوئی شاعر اپنی پوری زندگی میں ایک شعر بھی کام کا کہہ لے تو وہ اپنے مقصد میں گویا کامیاب ہو گیا۔

شعرائے متقدمین میں وہ غالب اور مومن کی سب سے زیادہ قدر کرتے تھے۔ مومن کے

متعلق اِن کا خیال تھا کہ اک زمانہ ایسا آئیگا جبکہ مومن کی قدر بھی غالب کی طرح کی جائیگی۔ فرماتے تھے کہ جس طرح ایک اچھی تصویر لینے کے لئے مناسب روشنی اور مقررہ فاصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعر کی پہچان کے لئے بھی ایک زمانی فاصلہ درکار ہے، جب مقررہ زمانہ آجاتا ہے تو شاعر کا کمال خود بخود اسکو ایک اچھی تصویر کی طرح اجاگر کر دیتا ہے۔

یہہ ایک نہایت عجیب وغریب بات ہے کہ اُردو کے تمام عظیم الشان شعرا جیسے میرؔ غالبؔ وغیرہ کسی کے شاگرد نہیں تھے چنانچہ فانیؔ صاحب کو کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اُن کی ابتدائے شاعری میں جبکہ وہ شمالی ہند میں تھے تو دکن میں دو اساتذہ داغؔ و امیرؔ تھے جنکی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوی تھی۔ لیکن فانیؔ کو اِن میں سے کسی سے اکتساب فیض کا موقع نہ مل سکا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ممکن ہوتا تو ضرور میں داغؔ کو اپنا کلام دکھلاتا۔ ان کو اپنے کلام کی خامیوں کا اعتراف بھی تھا۔ چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ معائب سے پاک صرف خدا کا کلام ہو سکتا ہے۔ اگر میرے کلام میں خامیاں ہوں تو کیا عجب ہے۔ مجھے جس طرح کہنا آتا ہے میں کہتا ہوں اگر میرے کلام میں کسی کو کوئی کارآمد شئے ملے تو لے۔ ان کا خیال تھا کہ حقیقی شعر صفحۂ ہستی سے کبھی نہیں مٹتا۔ جو شعر اچھا ہوتا ہے خود بخود دُنیا اُسے یاد رکھتی ہے۔ اور ناکارہ اشعار باوجود کوشش کے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کی دلیل میں وہ امیرؔ کا یہہ شعر پیش کیا کرتے تھے ؎

اپنے اشعار کو دیوان سے چھانٹو نہ امیرؔ خود ہی چھنٹ جائینگے جو شعر ہیں چھنٹنے والے

فانیؔ نظم کے مقابلے میں غزل کی اہمیت پر زور دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ غزل ہی شاعری کی ابتدا اور انتہا ہے۔ کوئی شخص غزل گوئی میں کمال حاصل کرلے تو اس کے لئے نظم کہنا کوئی مشکل کام نہیں اگر غزل کا کوئی شعر نظم میں آجائے تو اس کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

یہہ ایک امرِ مسلم ہے کہ کمال خود بخود شہرت کو اپنی طرف کھینچتا ہے چنانچہ فانیؔ کو ان کے کمال نے مشہور کر دیا۔ وہ نام اور شہرت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی رسالے کو وہ اپنا کلام نہیں بھیجتے تھے بلکہ احباب لیکر بھجواتے یا مدیران رسائل... کلام مانگ کرلے جاتے تھے۔

سلہ ساقی بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء کے پرچہ میں "فانی بدایونی" کے عنوان سے ایک تبصرہ نظر سے گذرا جس میں فانیؔ کو داغؔ کا شاگرد بتایا ہے۔ ہمیں تعجب ہے کہ مضمون نگار صاحب نے کن وثوق کی بنا، ایسا لکھا ہے۔ حالانکہ حضرت جگر مرادآبادی باقیاتِ فانی میں تبصرہ کرتے ہوئے اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ "فانی اپنی ایک مستقل ہستی رکھتے ہیں وہ کسی کے رنگِ تقلید کے مرہون منت نہیں یا بہ الفاظ دیگر وہ صرف تلمیذ الرحمٰن ہیں۔"

ایک شاعر جن کو اپنی قابلیت پر بڑا ناز ہے جو اکثر کلام فانی پر جا و بیجا تنقید فرمایا کرتے ہیں۔ ایک دن شاد آنجہانی کے مشاعرے میں فانی سے دوچار ہوئے۔ دوران مشاعرہ میں جب مرحوم نے اپنی غزل پڑھی تو شاعر موصوف تن کر بیٹھے رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ فانی کو حسب ضرورت کافی اشعار پر محفل سے داد ملی اور جب ناقد صاحب نے اپنی غزل پڑھی تو جو اشعار قابل تحسین تھے ان پر فانی نے خوب دل کھول کر داد دی۔ احباب فانی نے اعتراض کیا کہ وہ تو آپ کے کلام سنانے کے وقت نقش بہ دیوار بنے بیٹھے رہے۔ اور آپ نے اُن کی بلا وجہ تعریف کر دی۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ اچھی چیز کی ہمیشہ تعریف کی جانی چاہیئے۔ اس لئے میں نے ایسا کیا۔

مہر کی ۲۶ تاریخ اتوار کا دن تھا۔ ۵½ بج چکے تھے۔ آفتاب دن بھر کی کلفتوں سے تھک کر اور اگلے دن کے ہونے والے واقعہ سے متاثر ہو کر اشک خونیں بہاتا ہوا کنج مغرب میں آرام لینے کے لئے دوڑا جا رہا تھا کہ شہر حیدرآباد میں ایک دردناک خبر برق کی طرح ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ فانی اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے یہہ کہہ کر تلے پلی کا رخ کیا کہ

اب اُٹھا چاہتی ہے نعش فانی دیکھتے جائیں

رات کے ۷½ بجے نشرگاہ حیدرآباد سے یہہ خبر تمام کشور ہند میں پھیلائی گئی کہ رئیس المتغزلین، امام الشعرا، یادگار میر و غالب حضرت شوکت علی خان صاحب فانی بدایونی کا انتقال پُر ملال ان کے مکان واقع تلے پلی میں ہو گیا۔ اور کل نو بجے میت کی تدفین احاطہ یوسفین میں (جہاں داغ و امیر بھی مدفون ہیں) عمل میں لائی جائیگی۔ اس کے علاوہ ان مقامی اخباروں نے بھی جو بوقت شام شائع ہوتے ہیں مرحوم کے اس سانحہ کی اطلاع اور مختصر سوانح دی۔ غرض پیر کے دن تقریباً گیارہ بجے مرحوم کے دونوں فرزند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کثیر مجمع کے ساتھ جن میں امرا، شعرا وغیرہ سبھی تھے، اس مجسم شعر اور سراپا سوز و درد کو تہ خاک دبا کر اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ فانی جیسے عظیم المرتبت شاعر کی یاد ہمارے دل میں باقی ہے اور باقی رہیگی۔ جب تک کہ پیاری اردو رہیگی فانی کا جسد خاکی فنا ہو جائے، دنیاوی زندگی ختم ہو جائے لیکن فانی کا نام باقی رہیگا۔

سکندر علی خاں نادر

متعلم سال اول

تمنّا

سوادِ دل میں مرے تم نگار بن کے رہو
مثالِ ماہِ مبیں جلوہ بار بن کے رہو

تبسموں میں نہاں کیفِ شرمگیں ہو کر
خدائے حُسن کے رُخ کا نکھار بن کے رہو

جبینِ شوق پہ رنگینیٔ سحر ہو کر
دھڑکتے دل کا مرے تم قرار بن کے رہو

بہار و کیف کی بدمست کُن فضاؤں میں
مثالِ طائرِ نغمہ شعار بن کے رہو

وہ گیت جو کہ تمنّا کو گُدگُداتے ہیں
تم ایسے گیت کی برق و شرار بن کے رہو

اُداس رات میں جب چاند ہو نہ تارے ہوں
نگاہِ شوق میں تم انتظار بن کے رہو

جو دل رہا متنفر جلالِ شاہی سے
تم ایسے دل میں شہِ کامگار بن کے رہو

شباب و شعر کی رنگینیوں میں گُم ہو کر
حریمِ دل میں مرے نغمۂ یار بن کے رہو

عُروس بن کے جیو اور بہار بن کے رہو

سید احمد حسینی شاہد متعلم سال دوم

فانیؔ کی شاعری

محفلِ ادب سے فانیؔ کا چراغ زندگی اُٹھ گیا۔ یہ سچ ہے کہ موت، حیات کا جزو لازمی اور حصۂ آخر ہے مگر لائق صد ماتم ہیں وہ ہستیاں جن کی موت ملک و قوم کے ہمہ گیر نقصان کا باعث ہو۔ فانیؔ کی رحلت سے اُردو زبان اور اس کی شاعری کو سخت نقصان پہونچا۔

بعض واقف کار حلقے بیان کرتے ہیں کہ فانیؔ نے ابتدا ر میں حضرت مانی جائیسی لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا کہ ان کا سلسلۂ شاگردی ختم ہوگیا۔ اور انھوں نے پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

فانیؔ کی شاعری کے متعلق نئے مسلک کے حامی اور جدید رجحان رکھنے والے اہل فکر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُردو فانیؔ جیسے قنوطیت پسند شعرار کے بارسے دَبی جا رہی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ایسی شاعری سے قوم فائدے کی بجائے نقصان میں رہتی ہے۔ اُن کا یہ ادعا ہے کہ شعر اپنی جگہ اثر مجسم ہے، اگر وہ ذہنی ارتقار اپج، جدت، رجائیت اور مسرت کو کھو دے تو قوم زندہ نعش بنکر رہ جائیگی۔ اس خیال کے متعلق اس موقع پر تفصیلی بحث میں جانا مناسب نہیں۔ تاہم اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فانیؔ پر ایسا الزام ان کی شعریت کی شان میں افسوس ناک زیادتی ہے۔ جدید ادبی رجحانات خارجی شاعری کو بھی پسند نہیں کرتے، اور یہ سچ ہے کہ جبتک کوئی شاعر اپنی زندگی کے حقائق کو اپنی شعریت میں بلاکم و کاست جذب نہ کرلے۔ اس میں تاثیر کا رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ خدا غریق رحمت کرے حالیؔ کی بات یاد آتی ہے ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ۔۔۔ پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اس خیال کے پیش نظر اگر فانی اپنے شعر کی بنیاد اپنی مایوس زندگی پر نہ رکھتے۔ اس طرزِ اظہار کی بجائے ولولہ انگیز اور طرب آمیز خیالات کا اظہار کرتے تو وہ کچھ زیادہ اثر آگیں انداز نہ ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے اشعار میں شعریت نہ رہتی بلکہ وہ ایک ڈھکوسلا بن کر رہ جاتے۔ اس ڈھکوسلے کا اضافہ قنوطیت کے بارے اردو ادب کے لئے کہیں زیادہ ہوتا۔

فانی ہمارے عہد کے شاعر تھے۔ اور اُن کی زندگی ہماری ہی سی زندگی تھی۔ انھوں نے غمگین زندگیوں کے اثرات کو بیان کرنے میں اس سادگی اور بے ساختہ پن سے کام لیا ہے کہ کہیں کہیں فانی کا آئینہ جیلت ہم کو اپنی زندگی کا جلوہ دکھانے لگتا ہے۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ وہ اپنی حالت اس طرح پیش کرے کہ اس پر ہمیں اپنی حالت کا دھوکا ہو۔ حُسن و عشق کے باب میں فانی بڑی فیاضی سے درد انگیز اور مایوسانہ مضامین باندھتے ہیں۔ غلط نہ ہوگا، اگر فانی کے تعارف کے لئے انداز سخن اور طرز بیان کی مماثلت پر یہ کہا جائے کہ ان کے کلام میں ایک طرف میر کا سوز و گداز اور نزاکت و لطافت بیان کا لطف آتا ہے تو دوسری طرف شعر میں غالب کی فلسفیانہ روش کی اتباع بھی ہے، یہ سچ ہے کہ ہر شاعر اپنا ایک مقام رکھتا ہے، مثال کے سلسلے میں کسی استاد سے موازنہ اسکی شخصیت کو گرانے کے لئے نہیں بلکہ حتی الوسع اس کا اعتبار بڑھانے کے لئے ہوتا ہے۔ فانی اپنی پُرسوز زندگی کے اعتبار سے اپنی زندگی کو مجبوراً حاصل غم ہی سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ :-

ٹوٹا طلسم ہستیٔ فانی کے راز کا ؎ احسان مند ہوں۔ الم جاں گداز کا

اس کے ساتھ ساتھ وہ یقین دلاتے ہیں کہ

فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود ؎ شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

وہ سمجھنے لگے تھے کہ :-

ہر نفس آہ انفاس پر جانے کا مدا ؎ زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

ان کی درد پسندیاں انھیں اس التجا پر مجبور کرتی تھیں کہ :-

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو ؎ اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

اسی سلسلے میں کچھ اور شعر سنئے کہ خوکردۂ آزار شاعر عیش کے مقابل غم کو کس قدر متاع گراں مایہ تصور کرتا ہے کہ

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول ؎ تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

مجھ کو ترے نصیب نے روزِ ازل سے کیا دیا! ؎ دولتِ دو جہاں نہ دی۔ اک دلِ مبتلا دیا

فانی وہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غم راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

شاعر اپنی سخت جانی کی وجہ سے زندگی کو پشیمان دیکھتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ :-

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

موت آنے تک شاعر کے لئے زندگی خود موت بنی ہوئی تھی، کہتے ہیں کہ :-

آئی رہیگی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ اُٹھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اُٹھا

فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

شاعر نے بعض بعض جگہ زندگی کے فلسفہ جبر و اختیار کو دلچسپ پیرائے میں ظاہر کیا ہے، کہتے ہیں کہ :-

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اسی کے ساتھ انھیں بحیثیت انسان کے خود پر یہ بھی یقین ہے کہ :-

مایۂ اور اک ہستی ہوں تکلف برطرف
زندگی میری دروغ مصلحت آمیز ہے

وہ سوچتے ہیں کہ زندگی کی بنیاد تلخ پسندی پر ہے، کہتے ہیں کہ :-

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیرِ مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

فانی کو اپنے قسامِ ازل سے ایک اور بھی شکایت تھی کہ :-

ملا ازل میں مجھے مری زندگی کے عوض
وہ ایک لمحۂ ہستی کہ صرف خواب ہوا

فانی نے جب دیکھ لیا کہ وہ دنیا کی راحت ان کے لئے عنقا ہے تو اپنے آپ کو تسکین دیتے ہیں کہ :-

فانی بلائے مرگ سے غم کیجیے غلط
اب جستجوئے راحتِ دنیا نہ کیجیے

پھر یہ بھی بتاتے ہیں کہ :-

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہ گذر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

نامرادی حد سے گذری حالِ فانیؔ کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

آخر میں خوش ہوتے ہیں کہ:-

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیؔ نا امید کو موت کا آسرا دیا

ہستی کے وجود و قیام کو غالبؔ نے اس خیال کی روشنی میں دیکھا تھا:-

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

فانیؔ نے بھی خوب کہا ہے کہ

دنیا میں حالِ آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آکے رہا بے خبر گیا

آخر میں تسلیم کرتے ہیں کہ:-

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانیؔ
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

خواجہ عبدالقادر چشتی متعلم سال اول

غزل

بجلیوں سے اب نشیمن کو بچا کر کیا کروں
شمع انوارِ محبت کو بجھا کر کیا کروں

شرحِ اسرارِ تمنا ہیں مری آنکھیں ہی جب
جب محبت چھپ نہیں سکتی چھپا کر کیا کروں

دل تو اس کی یاد میں الجھا ہوا ہے بے طرح
ایک ظالم سے میں اب دامن چھڑا کر کیا کروں

دل سے انکی یاد مٹ سکتی نہیں ہرگز کبھی
پھر زباں سے یاد انکی میں مٹا کر کیا کروں

جبکہ آہوں کا اثر بیدرد پر ہوتا نہیں
داستانِ غم اسے آخر سنا کر کیا کروں

زندگی ناظمؔ سرائے موت ہے اور کچھ نہیں
اس سرائے موت میں میں دل لگا کر کیا کروں

سید ناظم علی ناظمؔ متعلم دہم

حضرتِ فانیؔ بدایونی

تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی ان کا نہیں نشانِ قبور

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم

اب رستم ہے اور نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

صبح کو طائرانِ خوش الحان
پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان

دنیا نے ایک کروٹ بدلی اور شاعری کو عروج ہوا جس کا سہرا امیرؔ کے سر ہے۔ میرؔ کو کبھی آرام نہ ملا اسی وجہ سے ان کے کلام سے قنوطیت برستی ہے بقول میرؔ فلک کو ان سے عداوت تھی۔ میرؔ کی زندگی بہت خراب گذری اور آخر دنیا کو خیرباد کہکر چلے گئے۔

میرؔ کے بعد زمانے پر غالبؔ بھی غلبہ نہ پا سکے، اور فلک کی شکایت کرتے کرتے ختم ہوگئے۔ پھر امیرؔ مینائی کا زمانہ آیا۔ امیرؔ کی ساری ثروت خاک میں مل گئی وطن کو خیرباد کہکر دکن کی زمین کو ہمیشہ کے لئے آباد کیا۔ امیرؔ کا رنگ میرؔ سے بہت زیادہ ملتا ہوا تھا۔ امیرؔ کے بعد اس رنگ کا شاعر صرف فانیؔ پیدا ہوا۔ فانی کے کچھ مختصر حالات معلوم ہوسکے ہیں وہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ؏ گر قبول افتد زہے عز و شرف

شوکت علیخاں نام، فانیؔ تخلص۔ والد کا نام شجاعت علی خاں صاحب۔ تاریخ ولادت نامعلوم ۱۸۷۹ء میں اسلام نگر ضلع بدایون میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا وطن خاص بدایون تھا۔ مگر چونکہ آپ ملازم سرکار تھے اس وجہ سے . . اس وقت بسلسلۂ تبادلہ اسلام نگر میں مقیم تھے۔

فانیؔ مرحوم کی ابتدائی تعلیم گھر پر ایک پُرانے طرز کے مولوی صاحب سے ہوی۔ پھر جب ۷ یا ۸ برس کے ہوئے تو بدایون ہائی اسکول میں داخل کردیے گئے۔ وہاں سے انھوں نے اعزازی نمبرات کے ساتھ میٹرک

پاس کیا۔ اس کے بعد بریلی کالج سے ایف۔ اے اور بی اے بھی اچھے نمبرات کے ساتھ نکالا۔ جب آپ کو قانون پڑھنے کا شوق ہوا تو آپ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔ اور ال ال بی، پاس کیا فانی مرحوم بہت زیادہ ذہین تھے، آج تک آپ کسی کلاس میں فیل نہیں ہوئے۔ فانی مرحوم کا شمار کلاس کے تیز لڑکوں میں ہوتا تھا، مدرسین بہت خوش تھے۔ قانون کامیاب کرنے کے بعد سب سے پہلے فانی نے بدایون کورٹ میں پریکٹس شروع کی اور کامیاب وکیلوں میں گنے جانے لگے۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد کچھ ایسے اتفاقات ہوئے کہ فانی کو ترکِ وطن کرنا پڑا۔ اور لکھنو کو آباد کیا، وہاں بھی مرحوم کی پریکٹس اچھی چلنے لگی تھی کہ تقدیر نے پھر پلٹا کھایا اور اس شعر کے مطابق حالت ہوئی۔ ؎

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

لکھنو کو خیرباد کہکر فانی نے اٹاوہ کی راہ لی اور اٹاوہ میں اپنے قدیم پیشہ یعنی وکالت کو چھوڑکر مدرسی اختیار کی اور اٹاوہ ہائی اسکول میں مدرسی کی جگہ پر تقرر ہوگیا مگر پھر طبیعت گھبرا گئی اور آپ نے وہ نوکری بھی چھوڑ دی اور پنجاب چلے گئے، وہاں آپ مہتمم کے عہدہ پر مقرر ہوگئے۔

پھر آگرہ کی کشش میں اضافہ ہوا اور کھنچ کر پنجاب سے آگرہ چلے آئے اور آگرہ میں پھر پرانا پیشہ یعنی وکالت شروع کی، ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اتفاقاً مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آنجہانی بسلسلۂ تفریح آگرہ تشریف لے گئے جہاں اور لوگ مہاراجہ سے ملاقات کیلئے گئے۔ فانی صاحب بھی تشریف لے گئے، مہاراجہ کے ہاں باریاب ہوئے، شعروسخن کی محفل گرم رہنے لگی۔ مہاراجہ کو ان کا کلام بہت پسند آیا، ان سے حیدرآباد آنے کے لئے کہا فانی نے رضامندی ظاہر کی اور پھر حیدرآباد چلے آئے۔

مہاراجہ کی نظر جوہرشناس نے فانی جیسے گوہرآبدار کی بہت زیادہ قدر کی۔ سچ ہے "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری" شاد آنجہانی نے فانی صاحب کو تعلیمات میں جگہ دلوادی۔ ان کا تقرر سب سے پہلے دارالشفا ہائی اسکول میں صدر مدرسی پر ہوا۔ ایک سال کے بعد چنچل گوڑہ ہائی اسکول میں تبادلہ ہوگیا۔ اس کے بعد ناندیڑ پر۔ اور وہاں کچھ عرصہ تک رہنے کے بعد جگتیال ہائی اسکول، پھر وہاں سے ورنگل کالج کی لکچراری پر مقرر ہوئے۔ وہاں کچھ ایسی صورتیں پیش آئیں کہ آپ کو خود علحدہ ہونا پڑا۔

فانی بہت حساس طبیعت واقع ہوئے تھے۔ ذرا ذراسی بات کا بہت زیادہ اثر لیتے تھے۔ قہر درویش بجان درویش کی مثل کے مطابق آپ ہر ایک بات کا غصہ اپنے اوپر کرتے اور کھول کھول کر رہتے، کسی سے اسکو ظاہر نہ کرتے نہ کسی سے رائے مشورہ لیتے۔ دل ہی دل میں ہر بات پر غور کرتے، اور بہت زیادہ سوچتے۔ اسی وجہ سے فانی ایک مقام پر بھی جم کر نہ رہ سکے، کیونکہ آپ جس کی بات بُری معلوم ہوتی، اس پر کبھی ظاہر

نہ ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بہت دردناک ہے۔

فانی فطری شاعر تھے اور بچپن ہی سے آپ نے شعر گوئی شروع کر دی تھی، آپ طالب علمی کے زمانہ میں کلام پر قابو پا چکے تھے۔ اور بڑے بڑے مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں جو کل ہند مشاعرہ علی گڈھ کالج ..... میں میر مہدی مجروح کی زیر صدارت ہوا تھا، اسمیں بھی فانی مرحوم نے کافی حصہ لیا تھا اور غزل بھی کہی تھی اور غزل کامیاب بھی رہی۔ اس مشاعرہ میں اسوقت کے تمام اساتذہ نے حصہ لیا تھا۔ مصرع طرح یہ تھا۔

اشک جو آنکھوں سے ٹپکا بڑھ کے دریا ہو گیا

اس غزل کو بہت زیادہ تلاش کیا مگر نہ مل سکی۔ معلوم ہوا ہے کہ مرحوم کے تین دیوان جو غیر مطبوع تھے چوری گئے اور جو چوتھا دیوان شائع ہوا ہے وہ کمیاب ہے۔

فانی کے کلام کی خاص صفت قنوطیت ہے، یاس و نا امیدی میر کی طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کلام پُر مغز زبان میں اثر اور مزہ ہے خیالات بلند تشبیہ استعارہ میں لطافت ہے۔ بیان میں جاذبیت اور طرز ادا میں دلکشی ہے۔ ہر غزل پر موت وزندگی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ بعض بعض غزلیں تو از مطلع تا مقطع مرثیہ نظر آتی ہیں۔

آپ باوجودیکہ دہلی اسکول کے حامی تھے مگر نہ معلوم آپ نے لکھنؤ کا رنگ کیونکر اختیار کر لیا تھا۔ مرحوم ..... استاد غالب مرحوم کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے، چنانچہ اکثر جج کی صحبت میں مرحوم غالب کا کلام پڑھتے تھے اور خوبیوں پر تبصرہ کرتے تھے۔ فانی مرحوم کے اکثر و بیشتر اشعار سے انکی زندگی کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں تو انکی ساری عمر پریشانی اور مصیبت میں کٹی مگر آخری زمانہ بہت تکلیف سے گذرا۔ آپ کو وطن چھوٹنے کا بڑا قلق تھا جیسا کہ شعر سے ظاہر ہے

گھر ہے اب قفس فانی گھر کبھی چمن بھی تھا
ہاں کبھی وطن بھی تھا اب کہاں وطن اپنا

آپ نے اپنی زندگی بنانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اور ہمیشہ گردش ہی میں رہے۔

اس کشمکش ہستی میں کوئی راحت نہ ملی جو غم نہ ہوئی
تدبیر کا حاصل کیا کہیئے تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی

مگر اس کے باوجود فانی نے اپنی وضعداری میں فرق نہ آنے دیا کہتے ہیں:۔

فانی وہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غم راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

اس شعر میں اپنی انتہائی پریشانی کا اظہار کیا ہے۔

دل کی ویرانی ہی عجب ہے وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں انکے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

بعض بعض جگہ مرحوم نے نہایت آسانی سے محاورے کو کھپایا ہے اور زبان بھی بے خلل ہے۔

یکتائے زمانہ ہونے پر صاحب یہ غرور خدائی کا
سب کچھ ہو مگر خاکم بدہن کیا کوئی خدا ہو جاتا ہے

ان اشعار سے ان کا اصلی رنگ ظاہر ہوتا ہے۔

ہجر سے نکی مفارقت فانیؔ ۔۔۔ لے مبارک ہو موت کا آغوش

موت کی نیند آگئی بیمار کو ۔۔۔ غیب سے سامان شفا ہو گیا
رفتۂ بیم خزاں تھی اس چمن کی ہر بہار ۔۔۔ خندہ گل تھا مگر بے گریہ شبنم نہ تھا

یہہ شعر انتہائی یاس و ناامیدی مجبوری ولاچاری کا مرقع ہے۔

تو اور کہیں ہم اور کہیں ممکن جو نہ تھا وہ ممکن ہے ۔۔۔ جب سنتے تھے تو ڈرتے تھے اب ٹی ہی تو سہتے ہیں

افسوس ہزار افسوس ہندوستان سے ایک ایسی ذات اُٹھ گئی جسکی جگہ پُر ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کل فانیؔ مرحوم کا ذکر کس مسرت اور خوشی کے ساتھ ہوتا تھا آج اظہار رنج و غم ہو رہا ہے۔

سید ذاکر حسین نقوی متعلم سال اول

زوالِ عروج

دیکھ اے ہمدم بہارِ قصرِ قیصر کی خزاں ۔۔۔ ہو رہے ہیں بام و در سب غرقِ مرگِ ناگہاں
جامِ مے خالی، صدائے چنگ و نے خاموش ہے ۔۔۔ محفلِ تنشیط گویا مرگ در آغوش ہے
منظرِ فرحت اثر ہے رو کشِ صحرائے غم ۔۔۔ نوحہ خواں ہیں مطربانِ خوشنوا با چشمِ نم
رقص فرما بزمِ جمشیدی میں ہے رقاصِ مرگ ۔۔۔ غوطہ زن ہے بحرِ استبداد میں غواصِ مرگ
طمطراقِ زر سے ہے افلاس سرگرمِ ستیز ۔۔۔ خرمنِ منعم پہ منڈلاتی ہے برقِ شعلہ ریز
فرقِ ایواں پر نظر آتا ہے تاجِ بے کسی ۔۔۔ زر پرستوں کی اجل پر ہنس رہی ہے زندگی
خود سری کو بے نوائی نے شکستِ فاش دی ۔۔۔ مان لی دنیا نے قوت بندۂ مزدور کی

لطیف شریف ساجد متعلم سالِ دوم

اِفتتاحی تقریر نائب صدرِ انجمن

جناب صدر، معزز لکچرار صاحبان اور عزیز بھائیو!

میں آپ تمام حضرات کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی یونین کا نائب صدر بنا کر کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

مجھے قوی امید ہے کہ میں اس اہم فرض کو آپ حضرات کی امداد اور اشتراکِ عمل نیز معزز لکچرار صاحبان کی سرپرستی میں بخوبی انجام دے سکوں گا۔

حضرات! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اتحاد میں کتنی زبردست قوت ہے۔ تاریخ عالم پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کے بننے اور بگڑنے کا راز اسی میں مُضمر ہے۔ اتحادِ عمل ہی سے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ میدانِ عمل میں آگے بڑھنا، اپنے مقصد کو حاصل کرنا، ناممکن کو ممکن بنانا اور حیرت انگیز کارہائے نمایاں انجام دینا یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم متحد ہوں۔

بھائیو! میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی آواز یونین کی آواز ہوگی۔ ہم میں سے جو ایک کہے گا وہ سب کہیں گے۔ کسی ایک کے رنج سے سب کو رنج اور ایک کی خوشی سے ہم سب کی خوشی ہوگی۔ اگر ایک کی بے عزتی ہو تو سب کی بے عزتی متصور ہوگی۔ ہم سب آپس میں ایک دوسرے کے شریک حال رہیں گے۔

حضرات! جب تک کسی کام میں نظم اور باقاعدگی نہ ہو وہ اچھی طرح نہیں چلتا۔ اس لئے ہم ایک نہایت باقاعدہ اور منظم پروگرام کے تحت جو عنقریب آپ کو معلوم ہو جائیگا کام کریں گے۔ اس پروگرام میں علمی مجلسیں، تقاریر، مباحثے، سوشیل گیادرنگ، اور تعلیمی تفریحات شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمارا سب سے بڑا فرض آپ حضرات کے حقوق کی حفاظت ہوگی۔ اور ہم اس کے لئے پوری کوشش کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ آپ یونین کی ہر آواز پر لبیک کہیں گے۔

عزیز بھائیو! کالج میں آکر نوٹس اور کتابوں کو رٹ کر کامیابی حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں اصل کامیابی یہ ہے کہ ہم اچھی تعلیم حاصل کریں جو کہ ہماری آئندہ زندگی اور کشمکش حیات میں مدد و معاون ہو سکے۔ وہ تعلیم جو ہم کو اتحاد عمل، اعلیٰ کردار، ایثار و قربانی، مساوات و اخوت سکھائے، بلاشبہ وہ تعلیم آپس کے برادرانہ تعلقات، علمی جلسوں اور لکچرار صاحبان کی کوششوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔

کالج میں ہندو طلباء، مسلمان طلباء، غریب طلبہ امیر طلبہ سب ایک ہیں اور سب کا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ حصول علم! اگر کسی وجہ سے ہم میں اختلافات پیدا ہو جائیں تو ہماری برادری نہیں ٹوٹ سکتی۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

عزیز بھائیو! کلیۂ بلدہ کی عظیم الشان عمارت، بہترین کتب خانہ، مشفق لکچرار صاحبان اور ہمدرد پرنسپل صاحب سے پورا پورا فائدہ حاصل کیجیے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یونین آپ کی ہر مشکل میں مدد کریگی اور کالج میں ایک بہتر فضا پیدا کریگی۔

آزادی سے بڑھکر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آزاد انسان پر وہ وہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو ایک غلام پر بھی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آزاد انسان پر بہت زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آپ حقیقی معنیٰ میں آزاد ہیں لیکن آپ پر اسی نسبت سے ذمہ داریاں بھی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔

میں گذشتہ وزارت کا اپنے اور پورے کلیہ کی طرف سے نہایت مشکور ہوں کہ انھوں نے پور فنڈ قائم کیا تاکہ ہمارے غریب بھائی اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ کلیہ کے غریب بھائیوں کو یونین کے قائم کردہ پور فنڈ سے ہر طرح کی مدد دیجائیگی۔

بھائیو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ یونین کی جانب سے بہترین علمی رسائل و اخبارات منگوائے جائیں گے جن سے آپ کو پورا پورا فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔

میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپس کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مٹا دیں۔ اپنے مقصد یعنی حصول علم کے لئے پوری پوری کوشش کریں اور اعلیٰ کردار پیدا کریں۔ آپ نوجوان ہیں قوم کی بڑی بڑی امیدیں آپ سے وابستہ ہیں اور وہ آپ کو امید کی نظروں سے تک رہی ہے۔ ایک بیدار ہونیوالا ملک، ایک خواب گراں سے جاگنے والی قوم کی ساری بے تابی، سارا ذوق و شوق، ساری سرگرمیاں، ساری وفراموشیاں آپ کے پیکر خاکی میں جلوہ گر ہیں۔ سب سے آخر میں پھر ایک بار میں آپ حضرات کا شکریہ

ادا کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ ہم آپ کی ہر طرح مدد کرنے کے لئے تیار ہیں اور آپ کی آواز ہماری آواز ہوگی بشرطیکہ وہ جائز ہو۔

ایک اور بات کہنی ہے وہ یہہ کہ ہم سب کو کلیہ کی روایات اور ضبط قائم رکھنا چاہیئے۔ مفید تحریکوں اور عمدہ جدّتوں سے کلیہ کی فضا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گرما دیجئے۔ آخر میں میں آپ سے اس دعا پر رخصت ہوتا ہوں کہ خدا ہمارے ارادوں کو کامیابی عطا فرمائے۔

سید عابد حسین رضوی
نائب صدر انجمن کلیتہ بلدہ

کالج سنسار

نتائج امتحانات انٹرمیڈیٹ، میٹریکولیشن اور ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحانات میں ہمارے کالج کے نتائج مجموعی طور پر اچھے رہے۔ مندرجۂ ذیل طلبہ امتیازات کے کامیاب ہوئے ہیں۔

انٹرمیڈیٹ (۱) سید مصلح الدین احمد مجموعی طور پر ممالک محروسہ میں سوم
(۲) سید صمدانی نقوی دینیات میں سوم

(۳) جی۔ ہنمنت ریڈی اخلاقیات میں اول
(۴) این۔ سری نواس ریڈی اخلاقیات میں دوم
(۵) سید مصلح الدین احمد طبعیات میں دوم
(۶) سید مصلح الدین احمد کیمیا میں سوم
(۷) ویانند کیمیا میں سوم
(۸) سید صمدانی نقوی فارسی میں اول
(۹) سید عبداللہ عربی میں دوم
(۱۰) خواجہ منظفر الدین " میں سوم
(۱۱) سید نصراللہ " میں سوم
(۱۲) سید صمدانی نقوی اردو میں اول
(۱۳) سید عبداللہ اردو میں دوم
(۱۴) سید خلیل اللہ تاریخ ہند میں دوم
(۱۵) ہنمنت ریڈی تاریخ ہند میں سوم
(۱۶) سید صمدانی نقوی معاشیات میں دوم
(۱۷) وینکٹ راحیا معاشیات میں سوم

انجمنوں کے انتخابات سالہائے اسبق کی طرح اس سال بھی انجمن اتحاد طلبۂ کلیہ و انجمن اتحاد طلبۂ فوقانیہ دونوں کے انتخابات کی سرگرمی آغاز سال ہی سے شروع ہوگئی تھی نئے طلبہ کے داخلے کے ساتھ ہر فریق انھیں اپنا ہم خیال بنانے میں ساعی تھا۔ تشہیر اور پروپاگنڈا کے مختلف طریقے اختیا

کئے گئے۔ نئے نئے انداز سے اشتہار بازی کی گئی اور ہر طرح وہ رُوں کو ہموار کیا گیا۔ لیکن ایک چیز اس دفعہ کے انتخابات کی خصوصیت ہے کہ انتخابی مہم کی تمام کارروائیاں پُرامن طریقے پر اور نہایت بھل مانسی کے ساتھ کی گئیں کسی قسم کا تصادم نہیں ہوا۔ ہر ایک فریق نے اپنی تشہیر اس طرح کی کہ مخالف فریق پر کسی قسم کی تعریض نہ ہوا اور انتخابات کی صحیح اسپرٹ برقرار رہے۔ چنانچہ جب انتخابات ختم ہوگئے تو پھر تمام طلبہ پہلے کی طرح شیر وشکر ہوگئے۔ اور کسی قسم کی بدمزگی اور رنجش دلوں میں باقی نہیں رہی۔ انجمن اتحاد طلبۂ کلیہ کے لئے حسب ذیل طلبہ منتخب ہوئے۔

نائب صدر سید عابد حسین رضوی متعلم سال دوم

معتمد ب۔ پرتاب ریڈی " "

نائب معتمد نرسہواں ریڈی " " اول

ارکان

(۱) شعبۂ تاریخ	محمد نظام الدین	متعلم سال دوم	(۲) شعبۂ تاریخ	رحمت اللہ خاں	متعلم سال اول
(۳) " ادب	محمد علی خاں	" " "	(۴) " ادب	فتح نصیب خاں	" "
(۵) " سائنس	غلام رسول	" "	(۶) " سائنس	میر کوثر علی	متعلم سال اول

اور انجمن اتحاد طلبۂ فوقانیہ کے لئے حسب ذیل طلبہ انتخاب کئے گئے:۔

معتمد سید احمد قادری متعلم شکستہ فارم

نائب معتمد حمایت علی خاں " جماعت دہم

ارکان

(۱)	سید محمد رضا	شکستہ فارم الف	(۲)	بابو رام چندر راؤ	شکستہ فارم ب
(۳)	اکرام حسین	نفقتہ فارم الف	(۴)	احمد علی	نفقتہ فارم ب
(۵)	سید معین الدین	جماعت دہم "	(۶)	غلام احمد خاں	جماعت دہم "
(۷)	سید محمد علی کاظمی	" ج	(۸)	محمد ابراہیم احمد	" نہم الف
(۹)	حلیم الدین	" نہم ب	(۱۰)	عبد المجید خاں	" " ج
(۱۱)	سید وحید شطاری	" ہشتم الف	(۱۲)	راجندر پرشاد	" ہشتم ب
(۱۳)	محمود علی اکبر	" " ج	(۱۴)	احمد شفیع	" " د
(۱۵)	آغا ابراہیم	جماعت ہشتم ھ			

انتخابات کے اعلان کے بعد دونوں انجمنوں کے کارکنوں کی کرسی نشینی کی تقریب علحدہ علحدہ عمل میں آئی۔ ان

جلسوں کی صدارت نگرانکار صدر کلیہ جناب مولوی غلام قادر صاحب نے فرمائی۔ کالج کی انجمن کے جدید نائب صدر سید عابد حسین صاحب کی افتتاحی تقریر جو جلسہ کرسی نشینی میں کی گئی تھی، اس شمارے میں کسی اور جگہ درج ہے۔ دونوں جلسوں میں گزشتہ سال کی رپورٹ کے بعد منتخب عہدہ داروں اور رکنوں کا اعلان اور ان کی گل پوشی ہوئی اور سابق معتمدین نے نئے کارکنوں سے بہترین توقعات کا اظہار کیا۔ اور نئے عہدہ داروں نے سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے طلبہ برداری کی خدمت اور فرائض مفوضہ کو حتی الامکان تن دہی سے انجام دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور جمیع طلبہ سے تعاون عمل کی درخواست کی۔ (ش س)

رپورٹ فٹ بال گزشتہ سال کی طرح سال حال بھی ہماری فٹ بال ٹیم کی مشق باضابطہ ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی، اضلاع پولیس، یونیورسل کلب، میڈیکل کالج اور مختلف مدارس سے کئی دوستانہ مقابلے ہوئے۔ ان مقابلوں میں ہماری ٹیم کو بہ حیثیت مجموعی نمایاں کامیابی ہوئی۔ لیکن بدقسمتی سے چند وجوہات کی بنا پر ٹورنمنٹ میں ہماری ٹیم ناکام رہی۔ اس سلسلہ میں بڑی دقت یہ ہے کہ ہمارا میدان ایسا نہیں جس پر ہمیں پورا قابو حاصل ہو جس کی وجہ سے ہماری مشق میں ہمیشہ رکاوٹیں درپیش رہتی ہیں، تاہم مولوی سید جمیل احمد صاحب اور کھلاڑیوں کی انتھک کوششوں نے ٹیم کا معیار بلند کیا۔ (ریاست علی خاں کپتان)

رپورٹ والی بال یوں تو ہر سال برادران کلیہ گیمس وغیرہ میں خاص دلچسپی لیتے ہیں مگر اس سال والی بال کو خاص امتیاز حاصل ہے جناب صدر کی سرپرستی، متعلقہ لکچرار صاحبان کی حوصلہ افزائی اور کھلاڑیوں کی غیر معمولی دلچسپی نے کھیل کے معیار کو بلند کردیا۔ اسمیں مولوی نظام الدین صاحب کی کوششوں کو خاص دخل ہے۔ چنانچہ ابتدائے سال سے لیکر اب تک کئی ٹیموں سے دوستانہ مقابلے ہوئے۔ جس میں ہمیشہ کامیابی ہوئی۔ ٹیم بہت جلد ٹورنمنٹ میں شریک ہونے والی ہے۔ (ابراہیم علی خان کپتان)

رپورٹ باسکٹ بال کالج کے کھلتے ہی ہم میں سے اکثر طلبا نے "باسکٹ بال" کی طرف خاص توجہ کی اور اس سے بیحد دلچسپی کا اظہار کیا۔ چنانچہ ہماری اچھی اسپرٹ کو متعلقہ لکچرار صاحبان نے دیکھا تو ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ اسی ہمت افزائی اور طلبا کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ ہم نے اس عرصہ میں متعدد دوستانہ مقابلوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اگر اسی طرح جناب صدر اور معزز لکچرار صاحبان ہماری ہمت افزائی فرماتے رہیں گے تو ہم آیندہ بھی اسی طرح کامیابیاں حاصل کرسکیں گے۔ (مقدر علی شریف کپتان)

رپورٹ کرکٹ امسال کرکٹ کی مشق برابر کیجاتی رہی۔ علاوہ ٹیموں کے روزانہ مشق کے موقع پر جناب احمد حسین صاحب خود تشریف لاتے اور اپنی تجربہ کارانہ ہدایتوں سے ٹیم کو معیار پر قائم رکھا جس کا ثبوت دوستانہ مقابلوں میں کامیابی ہے۔ ٹورنمنٹ میں بدقسمتی سے چند کھلاڑیوں کے بیمار ہونے سے ہماری ٹیم ناکام رہی۔ (زیدی)

انجمن اتحاد کلیہ | انجمن اتحاد طبقہ کلیہ کی رپورٹ کارگزاری مختصراً حسب ذیل ہے۔ تین علمی جلسے ہوئے جنکی صدارت خود انجمن کے نائب صدر نے کی۔

پہلے جلسے میں آنریبل سید محمد حسین صاحب ایڈوکیٹ الہ آباد نے طلبہ کو مخاطب فرمایا اور اپنے بیش قیمت تجربات اور سود مند نصائح سنائیں۔ اس جلسے میں جناب مخدوم محی الدین صاحب نے ایک نظم سُنائی۔

دوسرے جلسے میں مسٹر نور الحسن بی، اے (علیگ) ڈپ ایڈ (گلاسکو) نے "نوجوان اور سماجی سیوا" پر تقریر کی اور جناب ماہر القادری صاحب نے اپنی نظم سُنائی۔

تیسرے علمی جلسے میں جناب محمد احمد عثمانی صاحب لکچرار کلیۂ ہذا نے

" تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی تھا " پر تقریر فرمائی اور علی مرتضٰی صاحب سابق نائب صدر نے اپنی نظم سُنائی۔

ان جلسوں کے علاوہ دو انگریزی اور دو اُردو مباحثی جلسے ہوئے۔ اُردو مباحثوں کے عنوانات یہ تھے۔

"(۱) جنگ کی فتح صلح کی فتح سے زیادہ درخشاں ہوتی ہے"

"(۲) مخلوط تعلیم ہماری ترقی کے لئے ضروری ہے۔"

اور انگریزی مباحثوں میں "عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملنے چاہیئے" اور "مغربی تعلیم نے ہندستان کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا کہ اس سے نقصان ہوا ہے" پر بحث ہوئی حسب موقع بعض جلسوں کی صدارت نائب صدر انجمن نے کی، بعض کی معزز لکچرار صاحبان نے فرمائی۔

مشاعرہ | بتاریخ ۱۶ ر مہر روز جمعہ ۱۳۵۰ ف بصدارت جناب مخدوم محی الدین صاحب ایم، اے عثمانیہ کلیۂ بلدہ کے اعظم ہال میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جو رات کے ڈیڑھ بجے تک ہوتا رہا، مقامی نوجوان شاعروں کے علاوہ کئی کہنہ مشق شعرائے اپنا کلام سُنایا۔ مشاعرے کے معتمد مسٹر لطیف شریف ساجد بنائے گئے تھے۔

تعزیتی جلسے | اس سال ہماری بدقسمتی نے ہمیں ملک کی چند مایۂ ناز ہستیوں سے محروم کر دیا۔ پہلے ٹیگور اور بعدازاں فانی نے ہمیں داغ دئیے۔

انجمن ہذا نے ٹیگور کے انتقال کی خبر سنکر بتاریخ ۱۳ ر مہر روز شنبہ ۱۳۵۰ ف جناب غلام قادر صاحب وائس پرنسپل کلیۂ ہذا کی صدارت میں آنجہانی کی تعزیت میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جناب ابوظفر عبد الواحد صاحب لکچرار کلیۂ ہذا نے آنجہانی کی حیات پر ایک مختصر اور جامع تقریر فرمائی، سب نے قرار داد تعزیت کو استادہ ہو کر منظور کیا۔

دوسرا تعزیتی جلسہ فانی مرحوم کی وفات حسرت آیات پر بصدارت نائب صدر انجمن مقرر ہوا۔ علی مرتضٰی صاحب

سابق نائب صدر نے مرحوم کے کلام کی روشنی میں انکی حیات پر ایک مختصر تقریر کی۔ اور معتمد صاحب نے قرارداد تعزیت پڑھی جسکو حاضرین نے نہایت خاموشی کے ساتھ منظور کیا۔

تعلیمی تفریح | بتاریخ ۹ ر مہر ۱۳۵۰ف روز جمعہ ایک تعلیمی تفریح کی گئی۔ اس کے معتمد محمد نظام الدین احمد مقرر ہوئے تھے، صبح ۷ بجے طلبہ موٹر لاریوں میں کالج سے روانہ ہوئے، اور قلعۂ گولکنڈہ گنبد ہائے قطب شاہی، عثمان ساگر، حمایت ساگر اور مزرعہ آزمائشی حمایت ساگر کا تفصیلی مطالعہ و معائنہ کرنے کے بعد شام کے ۷ بجے واپس ہوئے، اس تفریح میں ۱۳۰ طلبہ اور مشفق لکچرار صاحبان شریک تھے۔ وائس پرنسپل صاحب نے بھی بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔

دار المطالعہ | کالج کے کتب خانہ اور دار المطالعہ کے علاوہ انجمن کا ایک علحدہ دار المطالعہ بھی ہے جسمیں ریاست و بیرون ریاست کے مشہور ادبی، سیاسی اور معاشری رسائل و اخبارات منگائے جاتے ہیں۔ محمد ابراہیم علی خاں کتب خانہ دار مقرر ہوئے جو اپنا قابل لحاظ وقت طلبہ برادری کی خدمت میں گزارتے ہیں۔

تحقیقاتی مضامین | طلبہ کے علمی ذوق اور تحقیقی شوق کے مدنظر اس سال ہر شعبہ کے طلبہ سے علحدہ علحدہ عنوانات کے مقابلے کے مضامین کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ہر شعبہ کے اچھے مضمون پر دو انعام مقرر کئے گئے ہیں۔

سید عابد حسین رضوی (نائب صدر)

انجمن اتحاد طبقۂ فوقانیہ | انتخابات و گلپوشی کی رسم کے بعد ہماری کابینہ نے اپنی سرگرمی شروع کی۔ سب سے پہلا کام تحریری مقابلہ کا انعقاد تھا۔ جس کا عنوان "ڈاکٹر ٹیگور کے حالات زندگی" تھا۔ اس مقابلہ میں (۱۱) طلبا شریک رہے۔ جسمیں سے حسب ذیل تین طلبا علی الترتیب اول دوم و سوم رہے:-

(۱) محمد علی انصاری متعلم جماعت دہم (الف) اول (۲) افتخار احمد متعلم جماعت دہم (الف) دوم (۳) محمد علی ناصری متعلم جماعت دہم (ب) سوم

ہماری فوقانی جماعتوں کے جماعت واری مباحثوں کے علاوہ مباحثۂ عام بھی منعقد کئے گئے جسمیں تمام جماعتوں کے طلبہ نے کافی حصہ لیا۔ اسمیں شک نہیں کہ عام مباحثے بہت کم منعقد کئے گئے۔ اسکی وجہ ایک تو وقت کی کمی دوسرے تعطیلات، اس بار کابینہ نے جناب صدر صاحب کلیہ سے درخواست کی کہ ہر جمعرات کو ۳½ بجے طلبائے فوقانیہ کو تعطیل دیجائے تاکہ طلبا اطمینان کے ساتھ حصہ لے سکیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ جماعت واری مباحثے ہر جمعرات کو منعقد کئے جائیں اور ہر پندرھویں دن ایک عام مباحثہ منعقد کیا جائے۔ جسمیں طلبا شریک رہیں گے۔ اس سال انجمن کی جانب سے ایک غیر طرحی مشاعرہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی صدارت میں منعقد ہوا جسمیں کلیۂ ہذا کے اور حیدرآباد کے مشہور شعرا نے حصہ لیا۔ حاضرین بھی کثیر تعداد میں شریک مشاعرہ رہے۔ تقریباً سو طلبا سیکلوں پر بغرض تفریح پہاڑی میر محمود کو گئے۔ جہاں پر طلبائے ایک دن گذارا۔ تفریح کامیاب رہی۔ محترم اساتذہ مولوی سید محمد صاحب، مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب، جناب بانکیم صاحب، جناب درا سوامی صاحب ہمراہ تھے۔ تفریح کے موقع پر مولوی سید محمد صاحب نے اردو میں اور جناب بانکیم صاحب نے انگریزی میں تقریر فرمائی، اسکے بعد طلبائے موسیقی کا مظاہرہ کیا۔ شام میں بخیر و خوبی طلبا اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔ (سید احمد قادری معتمد)